ماہنامہ

فکرِ نو

علی گڑھ

سال دوم | اگست ۲۰۱۹ء | شمارہ نمبر (۱۳)

مدیر

ریاض الرحمٰن شروانی

نائب مدیر

مدیح الرحمٰن صہیب

مجلس مشاورت:

• پروفیسر افتخار عالم خاں • پروفیسر اصغر عباس • ڈاکٹر عابد رضا بیدار

قیمت فی شمارہ: ۱۵ روپے | قیمت سالانہ: ۱۵۰ روپے

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ:

Dr. Madihur Rahman Sherwani
Habib Manzil, Marris Road, Aligarh-202002 (U.P.)
fikrenaualigarh@gmail.com

براؤن بکس، علی گڑھ

فہرست

نوٹ: مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ہر تحریر کی اخلاقی و قانونی ذمہ داری کو پیش نظر رکھیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ کاپی رائٹ سے وابستہ کسی اصول کی قانون شکنی نہ ہو۔

(مدیر)

اداریہ

مسلمانانِ ہند کی دو تحریکیں

اورنگ زیب کے بعد مغلوں کی عیش کوشی اور نادانی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو آہستہ آہستہ ہندوستان پر قابض ہونے کے مواقع مہیا کیے اور اس کے بعد ہندوستان براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیرِ نگیں آگیا۔ اُس کے ردِ عمل میں ہندوستان میں دو تحریکوں نے جنم لیا۔ ایک علی گڑھ تحریک جس کے سربراہ سرسید احمد خاں تھے اور دوسری دیوبند تحریک جس کی قیادت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہاتھ میں تھی۔ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے لی تھی اور وہ انھیں کے سب سے زیادہ دشمن تھے اس لئے سرسید احمد خاں کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کی دوری کم کی جائے اور مسلمان مغربی علوم سے مستفیض ہوکر ان کے دوش بدوش کام کرسکیں۔ اس کے لئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ انگریزوں سے تعلقات قائم کریں اور سیاست میں ایسا راستہ اختیار کریں جس میں ٹکراؤ نہ ہو بلکہ ملاپ ہو۔ اس کے برعکس مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے ہم خیال چاہتے تھے کہ انگریزوں سے جتنی جلدی ہوسکے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اس وقت کے حالات کی روشنی میں بہت مشکل، بلکہ محال نظر آتا تھا کہ ایسا ہوسکے۔ برادرانِ وطن نے انگریزوں سے پہلے مراسم استوار کرلئے تھے اور انگریزوں کی تعلیم بھی حاصل کرلی تھی۔ وُہ انھیں یہ بتاتے تھے کہ وہ مسلمانوں پر بھروسہ نہ کریں بلکہ ہم پر بھروسہ کریں۔ ہم اُن کے ساتھ مل کر کام کریں گے اور مُلک کے نظم ونسق میں ان کے حسبِ منشا تعاون کریں گے۔

ایسی صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حُدود کا لحاظ رکھنا مشکل ہوجاتا ہے اور آدمی ایک طرف کو پوری طرح جھک جاتا ہے۔ انگریزوں سے تعلقات بڑھانے میں بہت دفعہ ایسے اقدامات کرنے پڑے جو ملک کے مفاد میں نہیں تھے۔

اس کے برخلاف مولانا محمد قاسم اور ان کے ہم خیال بزرگوں نے یہاں مُلک پر انگریزوں کے قبضے کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ وہ ان علوم وفنون کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھے جنھیں اختیار کئے بغیر مُلک اور اہلِ مُلک کا مفاد اور اُن کی ترقی ممکن تھی۔ پروفیسر عبدالعلیم مرحوم نے ایک بات بہت اچھی کہی ہے کہ اگر دیوبند کی سیاست اور علی گڑھ کے تہذیبی رویے میں مفاہمت ہوسکتی تو یہ بہترین صورتِ حال ہوتی۔ لیکن شاید یہ ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ جو قدیم اقدار کے حامل تھے اور دوسرے وہ جو جدید کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار تھے۔

علامہ شبلی نعمانی نے بھی علی گڑھ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں یہ کوشش کی لیکن دونوں جگہ کے اربابِ اقتدار کے عدم تعاون کی بنا پر وہ بھی اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اسی طرح ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے بھی اس سمت میں نئے اقدامات کیے تھے لیکن آج ندوہ دوسرا دیوبند اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دوسرا علی گڑھ ہے۔

سرسید کو صحیح جانشین نہیں ملے۔ وہ سرسید کی سیاست سے تو چمٹے رہے لیکن ان کی ترقی پسندانہ اور صحیح خطوط پر پیش رفت کی طرف توجہ نہیں دے سکے۔ ہماری رائے میں سرسید کا اگر کوئی صحیح جانشین ہوا تو وہ ان کے پوتے نواب مسعود جنگ سر سید راس مسعود تھے اور بس۔ بہرحال جو صورتِ حال ہے اُس کا نتیجہ ہے۔ اتنا وقت گزر جانے اور ہر طرح

کی کوشش کے باوجود مسلمان آج بھی پچھڑے ہوئے اور اپنے مفادات کی حفاظت کرنے کے اہل نہیں ہوئے ہیں۔

دوسری طرف دیوبند تحریک اس حد تک تو بدلی ہے کہ اُس کے فارغین مغربی تعلیم بھی حاصل کرنے لگے ہیں اور مختلف میدانوں میں ترقی بھی کی ہے لیکن یہ انفرادی کوششیں ہیں۔ انھوں نے جو راستہ اختیار کیا اس کا فائدہ یہ تو ہوا کہ انگریز ہندوستان سے چلے گئے لیکن آج ہندوستان کے جو حالات ہیں اُن سے نجات حاصل کرنے کی کوئی راہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند مختلف مطالبات کرتے رہے اور کہتے رہے۔ یہی مطالبہ ہمارے سب مسائل کا حل ہے کبھی ہمیں یونیورسٹی چاہیے، کبھی جداگانہ انتخابات چاہیے کبھی دوسرا ملک چاہیے۔ یہ سب باتیں آگے پیچھے مان لی گئیں لیکن ہم آج شاید ہمیشہ سے زیادہ پریشان حال ہیں۔ اس کا کیا سبب ہوسکتا ہے اس کے کچھ اسباب تو ہمیں اپنی تاریخ میں ملیں گے جسے بدلنا ہمارے امکان میں نہیں ہیں۔ مختلف مسلم خاندانوں نے یہاں تقریباً سات سو سال حکومت کی ان میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے فرماں رواں ہوئے۔ انگریزوں کے زمانے میں مختلف لوگوں کا طرزِ عمل مختلف رہا۔ سیاست کسی ایک راستے پر نہیں چلی۔ علی گڑھ تحریک اور دیوبند تحریک کی اپنی اپنی سوچ تھی لیکن ان میں مستثنیات بھی تھے۔ دیوبند تحریک کا عام رویہ حریت پسندی کا تھا لیکن ساتھ ہی معاشرتی معاملات میں وہ شدت پسند تھے۔ علی گڑھ تحریک کے اثرات زیادہ تر معاشرے کے اعلیٰ طبقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ سرسید کو جو مخالفت، قدامت پسند مسلمانوں کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑی، اس کے ہوتے ہوئے انھوں نے جتنا کیا وہ بہت سے مسلمان مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے تاہم مغربی تعلیم اور تہذیب کے مثبت اثرات عوام پر اور خواتین پر بہت دیر میں پہنچے۔ سرسید کے زمانے کے دو طالب علموں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور خان بہادر شیخ عبداللہ نے بالترتیب یہ اثرات عوام اور خواتین تک پہنچائے۔ پھر بھی مسلمانوں کی سیاست زیادہ تر اونچے طبقے کے لوگوں تک محدود رہی اور انھوں نے اسے اپنے طبقاتی مفادات کے لیے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام الناس حالات سے متاثر تو ہوتے رہے لیکن اُن کی باگ ڈور ہمیشہ اعلیٰ طبقے کے ہاتھوں میں رہی۔ عوامی مفادات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔

دیوبند تحریک کے طور طریقے جیسا کہ اوپر لکھا گیا اگرچہ انفرادی طور پر کسی قدر تبدیل ہوئے لیکن اُن کی قیادت آج بھی قدامت کا شکار ہے۔

سوچنا یہ ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بہت سوچ وچار کے بعد ادارۂ علوم اسلامیہ قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مسلم ممالک میں جو علمی کام ہوا اُس پر تحقیق کی جائے اور ہندوستانی مسلمانوں میں اُسے رائج کیا جائے لیکن اس مقصد میں پوری کامیابی نہیں ملی۔ اس لئے اُسے دوسرے شعبوں کی طرح ایک شعبے میں تبدیل کردیا گیا۔ آج جامعہ ازہر (مصر) میں انجینئرنگ اور میڈیسن کی فیکلٹیاں قائم ہیں لیکن ہمارے بیشتر مدارس ابھی تک انگریزی پڑھنے اور پڑھانے پر بھی اپنے کو راضی نہیں کر سکے ہیں جس کا سبب ہے کہ ان کی فکر ایک جگہ جاکر رُک گئی ہے۔ دوسری طرف جدیدیت کا مطلب لامذہبیت لیا جاتا ہے جو سرسید کا مقصود بالکل نہیں تھا۔

انھوں نے شروع سے مشرقی بالخصوص اسلامی علوم کو اپنے کالج کے نصاب کا حصہ بنایا۔ رسماً وہ اب بھی قائم ہے لیکن بنیادی مقاصد کے حصول سے وہ اب بھی دور ہے۔ ان حالات میں سوچنا چاہئے کہ صحیح راستہ کیا ہے۔ سرسید کھلے ذہن کے قائل تھے اور تبدیلیوں کے ساتھ چلنے کے حامی تھے وہی راستہ ہمیں بھی اختیار کرنا ہوگا ورنہ کام نہیں چلے گا۔

ریاض الرحمٰن شروانی

☆

نئے ہندوستان کے ''اکلویہ''

تحریر: ہرش مندر / مترجم: پروفیسر افتخار عالم خاں

پسماندہ طبقات کے بچوں کے لئے عمدہ پرائیویٹ اسکول میں نشستیں مخصوص کرنے کے سلسلے کے جدید قانون کی اصلی اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہندوستان میں ہزاروں سالوں سے موجود نہایت منظم ''عدم مساوات'' کے باوجود پہلی بار امیر اور غریب خاندانوں کے بچے ایک ساتھ پڑھ، کھیل اور کھا سکیں گے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں سیکڑوں سالوں سے لاکھوں بچوں کو صرف اُن کے اتفاقیہ کسی ذات میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے تعلیم سے محروم رکھا گیا تھا، یہ حال میں نافذ کیا گیا جدید قانون ہمارے لاکھوں ''اکلاویوں'' کو گو تاخیر سے ہی سہی، پھر بھی تعلیم اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کا نادر موقع فراہم کروائیگا۔

اس قانون کے ذریعہ ہمارے تعلیمی نظام میں صدیوں سے موجود ذات پات کے بھید بھاؤ کو ختم کیا جا سکے گا۔ ہمارے اسکولوں میں پسماندہ طبقات کے بچوں کی موجودگی سے اسکولوں کے کلاسوں کو صحیح معنی میں جمہوری بنانے کا یہ عمل ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک اہم سنگِ میل بن جائیگا، بالکل اسی طرح جس طرح 1960 میں امریکہ میں شہری حقوق کی تحریک کے دوران ہوا تھا۔ اسکولوں میں نسلی امتیاز ختم کرنے کے سلسلے میں 1960 میں، امریکہ میں جس طرح کی بحث چلی تھی، تعجب ہوتا ہے کہ 'نہایت پر اسرار طور پر' اسی طرح کی باتیں آج ہندوستان میں بھی پسماندہ طبقات کے بچوں کے لئے پرائیویٹ اسکولوں میں نشستیں مخصوص کرنے کے سلسلے میں بھی سننے میں آ رہی ہیں۔ کچھ لوگ اس کو پرائیویٹ سیکٹر کے حقوق پر غاصبانہ حملہ قرار دے رہے ہیں، کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ غریب اور چھوٹی ذات کے بچے ان اسکولوں کے ماحول میں اپنے آپ کو یکساں طور پر ''فٹ'' نہیں کر پائیں گے، اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ اُن کو علیحدہ رکھا جائے۔ اس کے علاوہ چند دوسرے لوگوں نے کہیں زیادہ بد دماغی کے حامل بیانات دیئے ہیں، جیسے غریب بچے اعلیٰ پرائیویٹ اسکولوں کے عمدہ معیار کو تباہ و برباد کر دیں گے، وغیرہ۔

ملک کے عمدہ پرائیویٹ اسکولوں نے بجائے اس کے کہ وہ اس عمدہ سماجی ذمہ داری کو جو ان کو سونپی گئی تھی، خندہ پیشانی سے قبول کرے، مشہور اور نامی وکیلوں کی فوج تیار کرنا شروع کر دی تھی تاکہ غریب بچوں کے داخلے کے اس

قانون کو آئینی طور پر غلط قرار دیئے جانے کے لئے سپریم کورٹ سے رجوع کیا جاسکے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ عوام کی تعلیم کا انتظام کرے، گورنمنٹ اپنے اس فرض کو پرائیویٹ اسکولوں کو منتقل نہیں کرسکتی ہے۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ گورنمنٹ کو اُن اداروں میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے جن میں وہ پیسہ نہیں لگاتی ہے۔ گویا اُن کے خیال سے صابن بیچنے اور تعلیم بیچنے میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔

حالانکہ جدید قانون میں یہ شق موجود تھی کہ گورنمنٹ ، پرائیویٹ اسکولوں کو ہر غریب بچے کے لئے دس ہزار سے بیس ہزار روپیہ سالانہ مدد دے گی۔ اس سلسلے میں ان پرائیویٹ اسکولوں کا کہنا تھا کہ یہ رقم بہت قلیل ہے۔ جس کی وجہ سے یا تو اُن کو اپنے اسکولوں میں فیس بڑھانا پڑے گی، یا پھر اُن کو اپنے اسکولوں کا معیار گرانا پڑیگا، پھر جو منافع ہوتا ہے اس میں بھاری کمی واقع ہوگی، اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر زبردستی غریب خاندانوں کے بچے اُن کے اسکولوں میں داخل کیے گئے تو اُن کے اسکولوں کا مخصوص (جسے وہ اعلیٰ کہتے ہیں) کردار ختم ہوجائے گا۔

گورنمنٹ نے سپریم کورٹ میں داخل کیے گئے اپنے حلف نامہ میں نہایت عمدگی سے اس قانون کے سلسلے کی عقلی دلائل واضح کی تھیں، اُس میں کہا گیا تھا کہ پرائیویٹ اسکولوں کو منافع کمانے کے لئے اختیار کیے گئے پیشہ کے مترادف قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، اگر اِن کو گورنمنٹ کی کوئی گرانٹ نہیں بھی ملتی ہے تب بھی تعلیمی ادارے ہونے کی وجہ سے ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے اسکولوں کے کلاسوں میں جمہوری اقدار اور مساوات کو بڑھاوا دیں، جہاں مختلف معاشی طبقات اور سماجی گروہوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کو ایک دوسرے کے ساتھ باہمی میل جول سے رہنے کے مواقع مل سکیں، تاکہ آئندہ رواداری کا حامل ایک بہتر سماج تشکیل دیا جاسکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مساوات پر مبنی کلاس روموں میں جہاں امیر اور غریب دونوں طرح کے بچوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ کلاس روم کہیں زیادہ بہتر تعلیم فراہم کرواتے ہیں۔

پرائیویٹ اسکولوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ غریب اور نادار طبقات کے بچوں کے اُن کے اسکولوں میں آنے سے ان کے اسکولوں کے معیار کے گرنے کا خطرہ لاحق ہو جائیگا۔ اس سے اُن کا مطلب یہ بھی تھا کہ یہ طلبا بنیادی طور پر کم محنتی ہوتے ہیں۔ حالانکہ اُن سے پوچھا جانا چاہیئے کہ وہ کس طرح سے پڑھے لکھے امیر و کبیر والدین کے نازنخروں میں پلے بڑھے اُن بچوں سے جن کو پڑھانے کے لئے گھروں پر ہر طرح کی ٹیوشن اور دوسری سہولیات موجود ہوتی ہیں اُن کا مقابلہ اس لڑکی سے کیسے کرسکتے ہیں جو ایک نہایت گندی جھگی جھونپڑی میں پلی بڑھی ہو، جس کے ماں باپ دونوں اَن پڑھ ہوں، جو روز کی مزدوری پر اپنی گزر بسر کرتے ہوں، جس کے پڑھنے کی کوئی جگہ نہ ہو اور نہ ہی اُس کے پاس کوئی ہوم ورک کروانے والا ہو، جو کھلے میں ایک نل کے نیچے نہانے کے لئے مجبور ہو، جس کے سر دکھانا پکانے اور پانی لانے کی ذمہ داری کے ساتھ ہی اپنے چھوٹے بھائی بہن کی دیکھ ریکھ بھی شامل ہو۔

ان اعلیٰ پرائیویٹ اسکولوں کا دوسرا ''گمراہ کن'' جواز یہ بھی تھا کہ ان اسکولوں میں غریب بچوں کو داخل کرنے میں خود ان غریب بچوں کا بہت نقصان ہوگا۔ جنوبی بمبئی کے ایک اسکول کے

پرنسپل نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کس طرح ایک غریب گھرانے کا بچہ اپنے ہی علاقے کے ایک امیر وکبیر باثروت گھرانے کے بچے کے ساتھ برابری کے ساتھ رہ سکے گا۔

ہندوستان ٹائمز میں شائع ہونے والے ایک آرٹیکل میں بسنتی رائے نے لکھا تھا کہ جھگی جھونپڑی میں رہنے والے بچے کے لئے امیر وکبیر گھرانوں کے بچوں کے ساتھ رہنا ایک نہایت ہی دشوار کام ہوگا۔ وہ ہمیشہ ان بچوں کے درمیان ایک اجنبی بنا رہے گا۔ اُن کے درمیان تعاونی فرق ہمیشہ موجود رہے گا۔ ''ہندو'' کی سنڈے میگزین میں اجے کمار اسوامی نے لکھا تھا کہ وہ بچے جن کو اپنے گھروں میں پڑھنے لکھنے میں مدد نہیں ملتی ہے، ہمیشہ کلاس میں سب سے زیادہ کمزور رہتے ہیں، اور دوسروں کا مقابلہ نہیں کرپاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی سماجی حیثیت کی وجہ سے اُن کو دوسری بہت سی مشکلات بھی درپیش رہتی ہیں۔ جیسے اُن کے کپڑوں، یا اُن کے پاس دوسری جو چیزیں ہوتی ہیں، ان کا فرق یا پھر ان کے والدین کا رکھ رکھاؤ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں ایک غریب بچے کے لئے اس کی اپنی نظروں میں خود ان کی عزت کو کم کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے پرائیویٹ اسکولوں میں غریب بچوں کو امیر بچوں کے ساتھ پڑھانے کے بجائے بہتر یہی ہوگا کہ ایسے بچوں کی پڑھائی کے لئے علیحدہ اسکول قائم کئے جائیں۔

یہی وہ جواز تھے جو لفظ بلفظ اعلیٰ پرائیویٹ اسکولوں کی انتظامیہ، دہلی گورنمنٹ کے 2012 کے اس آرڈر کے خلاف دوہرا رہی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ دہلی میں واقع سب ہی اسکول 15 فیصد نشستیں غریب بچوں کے لئے مخصوص کریں۔

ان اسکولوں نے غریب بچوں کے لئے شام کے اسکول کھولے تھے جن میں ان کے مقابلے میں نہایت خراب پڑھائی کا انتظام تھا۔ یہ شام کے اسکول عام طور پر ہندی میڈیم اسکول تھے۔

میں نے دہلی گورنمنٹ کے اس آرڈر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے نہایت عمدہ اسکولوں میں اپنے سڑکوں پر رہنے والے بچوں کو جن کی ہم دیکھ ریکھ کر رہے تھے، داخل کروانے کی انتھک کوششیں کی تھیں لیکن ان میں سے ہر ایک اسکول نے ہماری اس درخواست کو نامنظور کر دیا تھا۔ صرف چند اسکولوں نے اپنے شام کے اسکولوں میں کچھ بچوں کو داخل کرنے کی رضامندی ظاہر کی تھی۔

اس جھوٹ کی پول کہ غریب بچے کبھی امیر بچوں کے ساتھ باہمی مساوات یا برابری کے ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں، ہمارے ان سابق سڑکوں پر رہنے والے چند بچوں نے کھول کر رکھ دی تھی جن کو 'سینٹ میری' جامعہ اسکول اور بلونت رائے مہتا اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ ہمارے یہ بچے جلد ہی پڑھائی میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرنے لگے تھے اور اپنی کلاسوں میں اول آنے کے ساتھ ہی اسپورٹس، میوزک اور ڈانس وغیرہ میں بھی اپنے جوہر دکھلانے لگے تھے۔ انھیں اپنی کلاس کے امیر گھرانوں کے بچوں سے دوستیاں کرنے اور گھل مل کر رہنے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

مجالس حسنیؒ

(ملفوظات سید ابوالحسن علی ندویؒ)

پروفیسر سید احتشام حسین ندوی

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ نے ایک نیا طریقہ قرآن مجید پڑھانے اور عربی سکھانے کا ایجاد کیا تھا اس کی اشاعت کے لئے انھوں نے ایک کتاب عربی زبان کے ''دس سبق'' لکھا تھا۔ پھر قرآن مجید کی پہلی کتاب، قرآن مجید کی دوسری کتاب اور قرآن مجید کی تیسری کتاب لکھی تھی۔ پہلی کتاب میں پہلے پارہ کے بارے میں ضروری تشریحات اور ہلکی گرامر تھی اور مشقیہ جملے تھے۔ ترجمہ کرنے کے لئے یہی حال تیسرے پارہ کا تھا۔ احمد علی کیانی نے تمرین الدروس لکھی۔ پر قرآن مجید پہلی کتاب پر مشتمل تمرین الدروس کا دوسرا حصہ لکھا پھر قرآن مجید کی دوسری کتاب پر مشتمل الفاظ تمرین الدروس کا تیسرا حصہ لکھا۔ چونکہ یہ الفاظ پہلے آچکے تھے ان کتابوں کو طالب علم آسانی سے پڑھ لیتا ہے۔

مولانا عبدالسلام نے اپنے نئے طریقہ سے قرآن پڑھانے کے لئے ایک ادارہ قائم کیا خاص امین آباد میں۔ اس کا نام 'ادارہ تعلیمات اسلام' رکھا۔ اس میں قرآن مجید اس نئے انداز میں پڑھایا جاتا تھا۔ صبح ۸ بجے سے ایک بجے تک پھر شام کو عصر سے عشاء تک۔ ادارہ میں پڑھنے کی کوئی فیس نہ تھی کوئی کلاس نہ تھی۔ انفرادی طور پر لوگ آتے تھے اور پڑھ کر چلے جاتے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ، آفس میں کام کرنے والے، وکلاء اور تبلیغ میں کام کروانے سب آتے تھے مگر یہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا اور لکھنؤ میں شرنارتھی کثرت سے آگئے تھے۔ ان کو روزگار فراہم کرنے کے لئے گورنمنٹ نے نہایت خوبصورت پارک عطا کردیا یعنی امین آباد پارک اس میں شرنارتھیوں نے دوکانیں کھول لیں۔ اس کے ایک کنارے مغرب کی نماز ہوتی تھی وہ۔۔۔۔ وہاں دوکانیں آگئیں۔

ادارہ تعلیمات اسلام دوسری منزل پر تھا امین آباد پارک کے سامنے۔ میں اس ادارہ میں ۳ برس عربی کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس میں پڑھنے کے لئے سابق امیر جماعت اسلامی ڈاکٹر عبدالحق انصاری آتے۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ نے ایک کورس شروع کیا تھا تین ماہ میں قرآن مجید کا ترجمہ سکھا دینا اور حدیث میں ریاض الصالحین پڑھا دینا اس کورس کا مقصد تھا۔ اس کورس میں رام پور کے سید رضوان علی ندوی آئے پھر وہ ندوہ میں داخل ہوئے اور انھوں نے دمشق اور قاہرہ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں اور کراچی یونیورسٹی میں پروفیسرشپ کے عہدے پر فائز ہوئے۔

حضرت علی میاں سے بہت قریب تھے چونکہ ادارہ

تعلیمات میں حضرت مولانا علی میاں کے ہفتہ وار خطبات ہوتے تھے اس لئے میں ان کی شخصیت سے بہت قریب تھا اور تقریروں کے درمیان پانی پلانے کی خدمت میں انجام دیتا تھا۔

کبھی کبھی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ گیارہ بجے دن میں مولانا عبدالسلام قدوائی سے ملنے آجاتے تھے اس وقت سارے ادارہ کے کارکن ان کے گرد جمع ہوجاتے تھے۔ مولانا عبدالسلام قدوائی، مولانا عبدالغفار ندوی، مشیر الحق خیر آبادی اور احتشام علی ندوی رحیم آبادی۔

یہ مقالہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بارے میں لکھا گیا ہے اس لئے مولانا علی میاں کا ایک قدیم ملفوظ یہاں پیش کیا جاتا ہے مگر کم عمری کی وجہ سے اس ملفوظ کی تاریخ نہ لکھی جاسکی، اس وقت اتنا شعور نہ تھا۔

میں مولانا عبدالسلام قدوائی کے ساتھ حضرت علی میاںؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ، حضرت محمد ثانی صاحب، مولانا محمد میاںؒ اور مولانا معین اللہؒ نائب ناظم ندوۃ العلماء مجلس میں موجود تھے۔ مولانا سید عبدالحی صاحبؒ نے اپنی ضخیم کتاب 'نزھۃ الخواطر' کا آخری حصہ نامکمل چھوڑا تھا اس حصہ کی تکمیل مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کی۔ حضرت مولانا املا بولتے تھے اور ان کے ادبی معاون مولانا نثار الحق ندوی وہ املا لکھتے تھے۔ حضرت مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ تم وہ حصہ پڑھو جو میں نے علامہ شبلی کے بارے میں لکھا ہے۔ مولانا عبدالسلام صاحب نے فرمایا کہ نثار الحق صاحب نے لکھا ہے ان سے کہئے کہ وہی پڑھ کر سنائیں۔ نثار الحق صاحب نے وہ سنایا۔ پھر فرمایا کہ 'نزھۃ الخواطر' کے آخر میں تذکرہ مولانا سید طلحہ حسنیؒ کا تھا مگر وہ مکمل نہ تھا اس کی تکمیل بھی مولانا علی میاںؒ نے کی اور نثار صاحب کو حکم دیا کہ وہ حصہ پڑھ کر سنائیں۔

اسکے بعد مولانا عبدالسلام قدوائی نے درخواست کی کہ وہ ان واقعات کا ذکر کریں جو مولانا علی میاںؒ کو ترکی کے سفر میں پیش آئے۔ حضرت علی میاںؒ نے فرمایا کہ میں ٹرین سے ترکی کے لئے روانہ ہوا پورا انتظام کرلیا گیا تھا۔ حضرت مولانا کے احباب سب ریلوے اسٹیشن پر وقت مقررہ پر آئے مولانا کو تلاش کیا پھر مایوس لوٹ گئے اس لئے کہ اگر ٹرین لیٹ ہوتی تو کوئی بات نہ تھی مگر ٹرین وقت مقررہ سے قبل پہونچ گئی۔ لہٰذا اسٹیشن پر کوئی نہ ملا۔ مولانا کے پاس ایک پتہ تھا اسی پر وہ چلے گئے۔ وہاں آفس تھا جس میں ایک شخص بیٹھا تھا اس کو مولانا نے ہنڈی دکھائی۔ اس نے ہنڈی کو پھاڑ دیا۔ مولانا قدوائی نے پوچھا کہ اس نے ہنڈی کیوں پھاڑ دی۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ وہ شخص ڈرتا تھا کہ یہ شخص غیر ملکی ہے اور پیسہ کا معاملہ ہے۔ اب یہ مشکل پیش آگئی نہ کوئی جاننے والا نہ کوئی بات سمجھنے والا۔ وہ شخص نہ انگریزی جانتا تھا اور نہ عربی۔ دونوں سے واقف نہ تھا اور نہ پیسے پاس۔ اس لئے کہ ہنڈی اس نے چاک کردی تھی، فرمایا کہ ایسا بے بسی کا منظر تھا کہ عقل کام نہیں کرتی تھی۔ آخر میں وہ سب احباب آگئے اور ساری مشکلات حل ہوگئیں۔

اسکے بعد حضرت مولانا کی ایک آنکھ کے ۱۳ آپریشن ہوئے۔ ایک آپریشن بمبئی میں ہوا۔ فرمایا کہ جب جرمنی میں

آنکھ دکھائی تو ایک ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کا جو آپریشن ہوا ہے وہ کامیاب نہ ہوگا اور موجودہ روشنی چلی جائے گی مگر دوسرے ڈاکٹر نے آنکھ دیکھی تو کہا کہ آپریشن صحیح ہوا ہے لیکن واقعی روشنی چلی گئی۔ فرمایا کہ دو ڈاکٹر کے درمیان تشخیص میں اتنا بڑا فرق باعث تعجب ہے۔ فرمایا کہ یہ سائنسی تجربات پر مبنی علوم کا حال ہے۔ ڈاکٹروں کا اتنا بڑا اختلاف قابل تعجب ہے۔

پھر جب مولانا امریکہ گئے تو اپنی آنکھ کا آپریشن کرایا۔ ایک یہودی ڈاکٹر تھا اور دوسرا عیسائی ڈاکٹر تھا۔ مولانا نے عیسائی ڈاکٹر سے آپریشن کرایا۔ ڈاکٹر نے مولانا سے فیس نہیں لی اور منیجر سے کہا اور رعایت کردی جائے جو ممکن ہو۔ حضرت مولانا کی روشنی واپس آگئی اور آخر تک رہی۔ وہ سب چیزیں خود پڑھ لیتے تھے۔ حضرت مولانا نے مولانا قدوائی سے مسکرا کر پوچھا کہ مولانا ضرورات ستہ میں سے کوئی ضرورت ہے؟۔ مولانا قدوائی نے فرمایا کہ نہیں۔ اس مجلس میں مولانا معین اللہ صاحب ندوی بھی موجود تھے۔ شام کو ہم دونوں وطن تھولینڈی ضلع رائے بریلی لوٹ آئے۔ تھولینڈی سے رائے بریلی ۲۰ کلومیٹر ہے۔ پہلے مولانا عبدالسلام قدوائی کو حضرت مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا معتمد تعلیمات مقرر فرمایا۔ پھر جب مولانا شاہ معین الدین ندوی کا دارالمصنفین میں انتقال ہوگیا تو حضرت علی میاںؒ نے اصرار کر کے مولانا عبدالسلام قدوائی کو ان کی جگہ پر دارالمصنفین بھیجا اور ان کو شریک ناظم بنایا۔

مولانا قدوائی نے صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے پاکستان جانے پر کئی ماہ معارف کے شذرات بھی لکھے اور کئی مقالات معارف میں لکھے۔ اور وہاں چار برس کام کیا۔

مولانا عبدالسلام قدوائی کے انتقال کے پر حضرت مولانا تھولینڈی تشریف لائے۔ مولانا قدوائی کی نماز جنازہ پڑھائی پھر دوسرے دن تھولینڈی تشریف لائے تعزیت کے لئے۔ قدوائی پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بڑا عمدہ مقالہ لکھا اور اتنا دلکش مقالہ شاید اس سے پہلے نہ لکھا ہو۔ نہایت ادبی اور نہایت تاثیر سے پُر۔ میں نے اس کو بار بار پڑھا۔ حضرت مولانا کو ان سے دلی تعلق تھا۔ مولانا قدوائی نے فرمایا کہ ایک زمانہ میں حضرت مولانا علی میاںؒ پر تصوف کے اثر سے عربی ادب اور اردو ادب کی بے وقعتی دل میں پیدا ہوگئی تو ایک سفر میں حضرت مولانا قدوائی نے مولانا علی میاں کے سامنے عربی پر قدرت کو تبلیغ اسلام کے لئے استعمال کرنے پر زور دیا اور اس کی عظمت کو دل میں بٹھایا۔ آخر میں تو مولانا علی میاںؒ عربی ہی میں کتابیں لکھتے تھے۔

وہ محفلیں کہاں ہیں وہ انساں کدھر گئے۔

☆☆☆

جاوید حبیب (خاکہ)

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

یونیورسٹی میں میرا پہلا سال تھا اور میں جامعہ ملیہ سے اسکول کی تعلیم ختم کر کے نیا نیا علی گڑھ آیا تھا۔ میں اکثر ایک شخص کو دو چار طالب علموں کے ہمراہ بہ آواز بلند بحث و مباحثہ کرتے اور غیر ضروری طور پر بال بڑھائے یونیورسٹی کی سڑکوں پر چلتے پھرتے دیکھا کرتا تھا۔ بی اے میں داخلہ لینے کے ساتھ ہی ہاسٹل میں رہائش کی جگہ کا مسئلہ درپیش تھا۔ وقتی طور پر اپنے ایک دوست کی دست گیری کے طفیل مجھے امین ہاسٹل میں قیام کی سہولت حاصل ہوگئی تھی۔ اس ہوسٹل کے قریب ہی ہر وقت باتوں میں مصروف رہنے والے لیڈر نما جاوید حبیب کا ہاسٹل بھی تھا۔ یہ تو مجھے رفتہ رفتہ معلوم ہوسکا کہ اس طالب علم رہنما کا نام جاوید حبیب تھا اور وہ اس سال اسٹوڈنٹس یونین کی صدارت کا الیکشن بھی لڑ رہا تھا۔ امین ہاسٹل میں عارف محمد خاں بھی رہتے تھے جو بہت بعد میں جا کر کانگریس کے اہم لیڈروں میں شامل ہوئے اور پھر کئی اہم وزارتی عہدوں پر بھی فائز رہے۔ اس وقت عارف محمد خاں یونین کی سکریٹری شپ کا الیکشن لڑ رہے تھے اور ان کے ایک بہت قریبی دوست قیصر محمود صدارت کے عہدے کے لیے امیدوار تھے اور ظاہر ہے کہ جاوید حبیب سے ان کا راست مقابلہ تھا۔ عارف محمد خاں سے میرا تعارف ابتدائی دنوں میں ہی ہوگیا تھا اور وہ اکثر آتے جاتے اردو زبان اور دینیات کی باتیں مجھ سے دریافت کیا کرتے تھے۔ ان کے توسط سے قیصر محمود سے بھی تعارف ہوگیا جو عربی میں ایم اے کر رہے تھے اور اردو اور انگریزی زبانوں پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ یہ تمام حوالے قیصر محمود سے بھی ابتدائی چند ہفتوں میں خاصی قربت اور اپنائیت کا سبب بن گئے۔ یونیورسٹی میں میرا پہلا سال ہونے کے باوجود مجھے متعدد بار الیکشن کی تقریروں میں ان کا ساتھ بھی دینا پڑا اور اس طرح پہلا سال ہونے کے باوجود مجھے بہت جلد اعتماد بھی حاصل ہونے لگا تھا۔ علی گڑھ کے مزاج کے برخلاف اس طرح ایک جونیئر طالب علم کے رکھ رکھاؤ میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔ اس پس منظر میں جاوید حبیب سے میرا تعارف تو ہوگیا مگر مجھے اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ ان کو اردو میں نیم ادبی اور نیم سیاسی تحریریں لکھنے کا بھی شوق ہے اور مزاجاً دوسرے طالب علم لیڈروں سے وہ مختلف بھی ہیں۔ اس زمانے میں ان کی سب سے بڑی کمزوری ان کا آئیڈیلسٹ ہونا تھا۔ ناپختہ ذہن کے طلبا میں ہنگامی طور پر مقبولیت حاصل کرنے یا کسی عہدے تک پہنچنے کی خاطر غلط صحیح وسائل اختیار کرنے اور خود فریبی میں مبتلا کر دینے والی وقتی قیادت کے عام مزاج کے برخلاف جاوید حبیب کا انداز فکر زیادہ گہرا، پختہ اور دوسروں سے خاصا

مختلف تھا۔ ایسے میں ان کا جو انجام ہونا تھا وہی ہوا یعنی وہ الیکشن میں بہت زیادہ ووٹوں سے ہار گئے۔ مگر چونکہ مزاج میں قیادت کے جراثیم ابتدا سے ہی موجود تھے اس لیے انھوں نے دو چار طالب علموں کا ایک چھوٹا سا گروہ ساتھ لئے چلنے، لگا تار اظہار خیال کرتے رہنے اور یونین کی تحریری اور تقریری سرگرمیوں میں مصروف رہنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر جاوید حبیب اور طلبا یونین کے الیکشن کی داستان کو لاکھ مختصر کیا جائے مختصر نہیں ہوسکتی کہ وہ دوسرے سال بھی شکست سے دوچار ہوئے اور پہلے تو وہ ایک باصلاحیت اور پڑھے لکھے امیدوار کے مقابلے میں ہارے تھے مگر دوسری بار ایک پہلوان صفت اور قیادت کی صلاحیت سے بالکل محروم شخص سے شکست کھا گئے۔ ظاہر ہے کہ الیکشن جیتنے میں مختلف اسباب کارفرما ہوتے ہیں جو اکثر مثبت نہیں ہوتے، چنانچہ جاوید حبیب تقریباً تین بار کی جدوجہد کے بعد ترحم کی حالت میں پہنچ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوگئے۔ اس پورے عرصے میں جاوید حبیب نے ادبی اور تحریری سرگرمیوں کے وسیلے سے اپنا ایک الگ حلقہ بنالیا تھا۔ ابتدا میں تو ان کے دوسرے احباب میں صرف فرحت احساس ایسے تھے جو اپنی ادبی اور تخلیقی سرشت کے باعث ان کے قریب تھے مگر پھر ان کے حلقے میں آشفتہ چنگیزی، مہتاب حیدر نقوی، عبید صدیقی، صلاح الدین پرویز جیسے متعدد ادبی اور شعری دلچسپیوں والے نوجوان شامل ہوگئے تھے۔ شمشاد مارکیٹ میں کبیر میاں کا ٹی ہاؤس تھا اور وہاں دیر تک نہ صرف چائے پی جاتی تھی بلکہ تمام احباب جمع ہوکر شعر و ادب، تہذیب و ثقافت اور عقیدے اور مسلّمات تک کے موضوعات پر بحث جاری رکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں محض اپنے بعض احباب کی وجہ سے راقم الحروف نے بھی اپنا نپا تلا وقت اس نوع کی صحبتوں میں صرف کرنا شروع کردیا تھا۔ فرحت احساس سائنس کے اپنے بہت عمدہ کیریئر کو تج کر بی اے یعنی آرٹس میں آچکے تھے اور ناچیز کے ہم جماعت بن چکے تھے۔ اس زمانے میں جاوید حبیب کو ایک اہم مسلم قائد اور مسلم مجلس کے بانی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے عقیدت کی حد تک قربت حاصل تھی انھوں نے فریدی صاحب پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی ایک بہت دلچسپ اور مختلف موضوع پر ایک اور کتاب بھی شائع ہوئی، جس کا نام تھا ''لیکن کتاب اچھی ہے'' ظاہر ہے کہ اس پس منظر کے ساتھ جب جاوید حبیب کے ہاتھ طلبا کی باضابطہ قیادت آئی تو پہلے سے بہت زیادہ پُراعتماد بھی ہو چکے تھے اور یونیورسٹی کے مختلف حلقوں میں جن میں طلبا کے ساتھ اساتذہ کے حلقے بھی شامل تھے، جاوید حبیب کو ایک خاص قسم کا اعتبار حاصل ہو چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے مشہور ماہر اقتصادیات پروفیسر علی محمد خسرو علی گڑھ آچکے تھے۔ خسرو صاحب کا مزاج شروع سے ہی شاعرانہ اور قدرے درویشانہ تھا۔ وہ حیدرآباد کی رنگارنگ تہذیب و ثقافت کے پروردہ تھے اور اسی کے باعث انہیں اساتذہ کے اشعار اور ادبی لطائف کثرت سے یاد تھے۔ جن کو وہ برمحل استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے اور اپنی اس صلاحیت کو وہ اپنی کامیاب اور بہتر کارکردگی کا وسیلہ بھی بنالیا کرتے تھے۔ جاوید حبیب تو خیر یونین کے صدر ہی تھے جس کی رسائی شیخ الجامعہ تک کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مگر جاوید حبیب کی یہ رسائی حد درجہ بے تکلفی اور قربت میں تبدیل ہوچکی تھی اور ان کے ٹی ہاؤس

والے ساتھیوں اور ہم مشربوں کا وقت بھی وقتاً فوقتاً شیخ الجامعہ کی محفلوں میں گزرنے لگا۔ ویسے تو تھی یہ کچھ عجیب بات کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی ایک بڑی دانش گاہ جس کے مسائل بھی کثیر ہوتے ہیں اور متنوع بھی وہاں کا وائس چانسلر بھلا مجلسی تضییع اوقات کے لیے وقت کیسے نکال سکتا ہے۔ مگر علی محمد خسرو اپنی افتادِ طبع کے مطابق اپنے مزاج کی تسکین اور اپنے تخلیقی اور شاعرانہ ذوق کی تشفی، کچھ اسی نوع کی محفلیں سجا کر، کرنے کے عادی تھے اور اس نوع کی مصروفیات ان کے لیے کچھ ایسی ناگزیر سی تھیں کہ وہ ہمہ وقتی سربراہ بنے رہنے کے برخلاف اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق بھی اپنے مشاغل جاری رکھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں جاوید حبیب پر انگریزی زبان پر پوری قدرت نہ رکھنے کا الزام بھی عائد کیا جاتا تھا۔ مگر تھے وہ بھی دھن کے پکے۔ پھر تو وہ ہمہ وقت انگریزی میں بات کرنے پر تل گئے۔ حتیٰ کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہ بڑی بے تکلفی سے انگریزی زبان میں اپنے مدعا کا اظہار بھی کرنے لگے تھے اور لکھنے پڑھنے کے کسی بھی معاملے میں انگریزی زبان ان کے لیے ویسے ہی سہولت اظہار کا وسیلہ بن گئی جیسی اردو تھی۔ اس عرصے میں جاوید حبیب نے اپنی طالب علمی کی تکمیل کر لی تھی۔ وہ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر چکے تھے اور اب ان کی اگلی منزل دہلی تھی۔ جہاں مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے ان کی یاد اللہ بھی قائم ہو چکی تھی اور اس وقت کے مقبول ترین وزیر اٹل بہاری باجپئی سے جاوید حبیب کی راہ و رسم بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسز اندرا گاندھی کی نافذ کردہ ایمرجنسی کے بعد کے الیکشن میں ایمرجنسی کے منفی اثرات نے کانگریس پارٹی کو تقریباً اکھاڑ پھینکا تھا اور جنتا پارٹی کے نام سے حزب مخالف کی مختلف جماعتوں کا انضمام برسر اقتدار آ چکا تھا۔ توقع یہ تھی کہ جاوید حبیب کو یا تو پارلیامنٹ یا کسی ریاست کی اسمبلی کا ٹکٹ مل جائے گا یا کم از کم چور دروازہ سے انہیں راجیہ سبھا میں داخل ہونے کا موقع مل جائے گا۔ مگر یہاں بھی ان کی آئیڈیالزم حائل ہوئی اور ایسا کچھ نہیں ہو سکا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جاوید حبیب ابتدا سے ہی مسلم قیادت کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کر چکے تھے اور علی گڑھ میں طلباء کی قیادت نے ان کی اس شناخت کو اور بھی مستحکم کر دیا تھا۔ ان کے لیے یہ بات آسان نہ تھی کہ اٹل بہاری باجپئی جیسے جن سنگھ/آج کی بی جے پی کے کسی تسلیم شدہ لیڈر کے توسط سے راجیہ سبھا میں پہنچ جائیں۔ وہ بار بار سیاسی اور دنیاوی کامیابی کے لبھاؤ میں آتے تھے مگر ان کے اندر کا آئیڈیالوجسٹ دانشور انہیں آسانی سے ایسا کچھ کر ڈالنے میں رکاوٹیں پیدا کرتا رہتا تھا۔ یہ کشمکش ان کے اندر تادم حیات جاری رہی۔ انھوں نے تقریباً دس بارہ سال کا عرصہ جامعہ کے علاقے میں ذاکر نگر کا ایک مکان کرایہ پر لے کر گزارا۔ اس مکان میں شروع کے کئی سال پوری طرح انھوں نے اس طرح گزارے جیسے وہ کسی معمولی سے گیسٹ ہاؤس میں رہ رہے ہوں۔ ان کے ساتھ راحت محمود، فرحت احساس اور جاوید حبیب کے سگے بھائی مجیب میاں بھی قیام پذیر تھے۔ مگر ان کے علاوہ علی گڑھ کے احباب کثرت سے وہاں آتے، وقت گزارتے اور واپس چلے جاتے تھے۔ جس کا جی تنہا وقت گزارنے کا ہوتا وہ بھی گزارا کر لیتا تھا مگر وہاں زیادہ تر سیاسی امور پر تبادلہ خیال ہوا کرتا تھا۔ ان میں بھی مسلم قیادت اور سیاست کے معاملات زیادہ زیر بحث رہا کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بابری مسجد کا مسئلہ بڑی شدت

اختیار کر چکا تھا۔ بابری مسجد کے مسئلے پر سید شہاب الدین، ظفریاب جیلانی ہوں یا جاوید حبیب سب کے خیالات کبھی ایک دوسرے کی تائید میں اور اکثر مختلف ہوا کرتے تھے۔ اس عرصے میں جاوید حبیب نے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی نکالنا شروع کیا تھا جس کے روح رواں تو جاوید حبیب تھے مگر تحریری اور فکری طور پر اس کی باگ ڈور فرحت احساس کے ہاتھ میں تھی۔ نہایت گہرے تجزیاتی اور طنزیہ مضامین، سیاسی تبصرے اور تہذیبی مسائل پر نت نئے مضامین اس اخبار میں شائع ہوا کرتے تھے۔ صحیح معنوں میں فرحت احساس کو ایک عمدہ نثر نگار اور ذہین و فطین صحافی اور نامہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہونے کا موقع اسی اخبار کے وسیلے سے ملا۔ چنانچہ جب وہ بعد کے زمانے میں قومی آواز کے ادبی ایڈیشن کے مرتب اور ایڈیٹر مقرر ہوئے تو ان کی آواز نہ یہ کہ محض سنی جاتی تھی بلکہ ایک بڑے حلقے کو ان کے مضامین اور تبصروں کا انتظار رہا کرتا تھا۔ قومی آواز کے اس سنڈے ایڈیشن میں جو ادبی ایڈیشن بھی تھا، اس زمانے میں بہت اعلیٰ درجے کے تبصرے، ادبی مضامین اور سیاسی و تہذیبی کالم شائع ہونے لگے تھے۔

جاوید حبیب کو متعدد بار راجیہ سبھا کی ممبر شپ کی آفر بھی ہوئی مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات سے خوف زدہ رہے کہ ان کو اصولی اور باکردار لیڈر کے طور پر جاننے والے لوگ ان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ مگر یہ بات ان کے اکثر دوستوں کو معلوم تھی کہ ان کے مصارف، مہمان نوازی کے وسائل اخبار نکالنے تک کے اخراجات کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کی مدد سے ہی پورے ہوا کرتے تھے۔ سنا جاتا تھا کہ جگجیون رام کے بیٹے سریش رام اور اٹل بہاری باجپئی مختلف اوقات میں ان کے مددگار رہے تھے۔ مگر چونکہ وہاں کے خزانچی راحت محمود چودھری تھے اس لیے ہر طرح کی حقیر یا خطیر رقومات کا حساب کتاب بہت جلد اپنے انجام تک پہنچ جایا کرتا تھا۔

جاوید حبیب کے ان دوستوں نے جنھوں نے اپنا سفر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طلبا قیادت سے شروع کیا تھا ان میں کوئی سیاسی اقتدار کا حصہ بننے کے بعد وزارت کے عہدے تک پہنچا، کوئی بغیر کسی ذاتی صلاحیت کے راجیہ سبھا تک پہنچا اور کسی نے کسی اور انداز میں سیاسی مفادات پورے کیے مگر جاوید حبیب نے جس بے سروسامانی کے ساتھ اپنا سیاسی سفر شروع کیا تھا تادم واپسیں اسی طرح بے سروسامانی کے ساتھ وہ بے یار و مددگار ہی بنے رہے۔ ناچیز نے ایسے لوگ کم دیکھے ہیں جن کے نزدیک سیاسی مقاصد سے وابستگی کے باوجود کوئی لائحہ عمل نہ تھا۔ انھوں نے صرف مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرنے، بولتے رہنے اور علی گڑھ سے لے کر اقوام متحدہ تک کے مسائل پر اپنے نقطہ نظر کو پیش کرنے پر ہمیشہ اپنی پوری توجہ مرکوز رکھی۔ جاوید حبیب کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کے سارے مسائل بابری مسجد کے مسئلے میں سمٹ آئے تھے۔ اس لیے وہ اس مسئلے کے حل کی نئی نئی تجویزیں لے کر آیا کرتے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ بابری مسجد کے مسئلے پر تو انتہا پسند ہندوؤں نے کبھی مسلمانوں کو عملی طور پر اس مسئلے کا فریق اول یا فریق ثانی تک سمجھنے کا ثبوت بھی نہیں دیا تھا۔ چنانچہ دو تین سال تک شدید فرقہ وارانہ فضا کو ہوا دینے کے بعد بالآخر ایسا ماحول بنا لیا گیا کہ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں تاریخ انسانی کے ساتھ ثقافتی ورثے اور اخلاقیات کی پامالی کا نقطۂ عروج

سارے ہندوستانیوں نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے بالآخر دیکھ لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، جس طرح کی فضا پورے ملک میں بنی، بمبئی میں جس طرح اس کا ردعمل سلسلہ وار بم دھماکوں کی شکل میں سامنے آیا یہ سب الگ الگ کہانیاں ہیں۔
مگر جاوید حبیب بابری مسجد کی شہادت کے نتیجے میں جس شدید صدمے اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہوئے کہ وہ بالآخر ان کی وفات تک ان کے لیے سوہان روح بنا رہا۔ ایک طرف تو یہ ان کا ذاتی دکھ اور جذباتی تہلکہ تھا اور دوسری طرف پوری قوم کی طرف سے بالعموم اور محلے پڑوس سے لے کر ملکی سطح تک لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے دیتے وہ نیم دیوانہ سے ہو گئے تھے۔
اب تو ان کی باتیں تک اتنی مربوط نہیں ہوا کرتی تھیں کہ سننے والا ان کی گل افشانیٔ گفتار اور فکری جولانی کی کشش کو ہی محسوس کر پاتا۔ وہ بابری مسجد کے حادثے کے بعد بھی کبھی علی گڑھ آتے تو تھے اور کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر ناچیز کو بھی ملاقات کا شرف بخشتے تھے مگر اکثر ان سے ملاقات اور تبادلہ خیال لاحاصل گفت وشنید کے مصداق ہو جایا کرتی تھی۔
جاوید حبیب کی مثال دراصل ایک غیر منظم شخصیت کی تھی۔ ایسے لوگوں کی ہمارے معاشرے میں کمی نہیں جو اپنی تمام تر صلاحیتوں کی موجودگی کے باوجود ان صلاحیتوں کے عشر عشیر تک کا استعمال نہیں کر پاتے۔ کوئی نہ کوئی افراط وتفریط راستے میں حائل ہو جاتی ہے، کبھی توازن کی کمی انھیں لے ڈوبتی ہے اور کبھی حد سے بڑھی ہوئی اپنے طے کردہ مقاصد پر اصرار اور ان مقاصد کا جنون انہیں دوسری صلاحیتوں کے استعمال کا موقع ہی فراہم نہیں کر پاتا۔ کہنے کو تو تعلیمی اداروں میں اس قسم کی مثالیں کثرت سے دیکھنے کو ملتی ہیں مگر نشوونما کے جو امکانات تعلیم کے دوران ہوتے ہیں وہ نسبتاً نیم پختہ ذہنوں کو زیادہ راس آتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہوتی ہے کہ جب عمر اور ذہن میں کچھ نہ کچھ کچا پن ہوتا ہے تو یہی ناپختگی حواس اور جذبات کے وفور کا زمانہ بھی ہوتا ہے اور یہی جذباتی اور حسی وفور بہت سی خواہشات کا توازن بگاڑ دیتا ہے اور بعض خواہشات یا مقاصد اور ان کے حصول کا جنون ناپختہ ذہنوں میں ان کی ترجیحات کو کبھی متعین نہیں ہونے دیتا۔
جاوید حبیب کی شخصیت، ذہنی نشوونما اور امتداد وقت کے ساتھ المیے کے مرکزی کردار کی طرح، ان کے زوال کو تشکیلی دور کی افراط وتفریط کا مناسب ترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔
اب یہی دیکھئے کہ ان کے اندر زبان وبیان پر غیر معمولی قدرت کے باعث لکھنے لکھانے اور ایک عمدہ صحافی اور اہل قلم بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھیں مگر یہ صلاحیت تقریباً چالیس سال تک ان کے نامناسب سیاسی فیصلوں کے باعث پس منظر میں ہی پڑی رہی۔ جاوید حبیب میں تنظیمی صلاحیت کا تقریباً فقدان تھا۔ وہ اپنے کسی بھی مقصد کی تکمیل کے لیے جو طریق کار اختیار کرتے تھے اس کو اختیار کرنے میں ترجیحات کے قسم کی کوئی چیز پیش نظر نہیں رکھتے تھے۔ جاوید حبیب کو اپنی ذات کی مرکزیت کے سامنے مردم شناسی کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اس لیے علی گڑھ اور دہلی میں جو لوگ ان کی معیت اور صحبت کی وجہ سے سربرآوردہ ہوئے انھوں نے خود جاوید حبیب اور ان کے رفقا کے غلط سیاسی فیصلوں اور اپنے اپنے طریق کار کے نقائص کا خمیازہ بھگتنے کے لیے جاوید حبیب کو ہی پیش پیش رکھا اور اہم شخصیات سے قربت، مالی منفعت اور سیاسی حیثیت حاصل کرنے پر اپنی ذات کی حد تک ساری توجہ مرکوز رکھی۔ دہلی کے

ان مصاحبین میں سے ایک صاحب تو اس زمانے میں ذاکر نگر کے مہمان خانے میں انتظام و انصرام کے نگراں رہے۔ جو آمدنی بھی جاوید صاحب کے توسط سے حاصل ہوتی تھی اس کا حساب و کتاب ان صاحب کے ہی ہاتھ میں ہوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ جاوید حبیب خود تو روپے پیسے کے حساب سے بے نیاز اور مالی منفعت کا کوئی لالچ اپنے اندر نہیں رکھتے تھے مگر ان کے مصاحبین میں سے بعض نے سیاسی روابط میں بھی بے حد تیزی اور تندی دکھائی۔ مسلم رہنماؤں میں بھی ان کا شمار کیا جانے لگا اور قطرے قطرے سے بڑھتے ہوئے انھوں نے مالی اور معاشی فوائد کے دریا بھی بہادیے اور دوسرے فوائد بھی حاصل کیے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد جب جاوید حبیب پر اپنی ملت، قوم اور مسلمانوں کے سواد اعظم کی طرف سے افتاد پڑی تو اس طرح کے لوگ دور کھڑے اس تلاطم میں محض ایک تماشائی کی طرح جاوید حبیب کو ڈوبتا ابھرتا دیکھتے رہے۔

المیہ ڈراموں کے ہیرو کا سب سے بڑا سانحہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے عمل میں فیصلے کی کوئی غلطی کرتا ہے اور بھرپور ڈرامہ اس کے غلط فیصلے کے باعث درد و غم اور اذیت کا مصداق بنتا چلا جاتا ہے۔ جاوید حبیب نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اور اس کے بعد بھی احباب کے انتخاب میں ہمیشہ ذاتی اور جذباتی قربت کو ترجیح دی۔ چنانچہ ان کے احباب یونین کے الیکشن میں ان کے لیے سیاسی طور پر کسی بھی مرحلے میں مفید ثابت نہیں ہو سکے۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد دہلی میں کسی مخصوص سیاسی پارٹی کا دامن تھامے بغیر بھی وہ سیاسی منفعت کے متمنی رہے، جس میں سیاسی قائدوں کو بھی کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی تھی اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ جاوید حبیب اپنی آئیڈیالزم کے باعث یکسوئی کے ساتھ سیاسی فائدے حاصل کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھ ہی نہیں پاتے تھے۔

جاوید حبیب کے ذہنی خلفشار اور انتشار خیالی میں خارجی، سماجی اور سیاسی اسباب کے ساتھ ساتھ گھریلو اور داخلی اسباب و عوامل بھی کم کارفرما نہ ثابت ہوئے۔ ان کی بیگم صاحبہ ہر چند کہ بحیثیت استاد کے جامعہ ملیہ کے استادوں کے کالج (یعنی ٹریننگ کالج) سے پروفیسر ہوکر سبکدوش ہوئیں مگر دونوں میاں بیوی میں ذہنی اور جذباتی مناسبت نام کو بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نتیجے کے طور پر بچوں کی طرف بھی پوری توجہ مبذول نہ کی جاسکی۔ بدقسمتی سے ایک بیٹا یوں بھی ذہنی طور پر کمزور تھا اس لیے لگاتار اس کی نگہداشت ناگزیر تھی۔ یہ پہلو بھی والدین کی توجہ کا جس قدر محتاج تھا اس کی تکمیل نہ ہونے کے باعث خانگی مسائل و معاملات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا جو جاوید حبیب کے دل و دماغ کو مزید انتشار میں مبتلا کرنے میں اہم رول ادا کرتے رہے۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ جاوید حبیب ہر زمانے میں ہر دل عزیز اور اپنے اساتذہ، احباب اور متعلقین کے پسندیدہ شخص رہے۔ مشکل سے ہی کوئی شخص ایسا رہا ہوگا جو شخصی اعتبار سے جاوید حبیب کو ناپسند کرتا رہا ہو۔ علی گڑھ میں جتنی بھی سربرآوردہ شخصیات تھیں ان کے لیے اگر کوئی نمائندہ اور پسندیدہ اسٹوڈنٹ لیڈر ہو سکتا تھا تو وہ جاوید حبیب تھے۔ جاوید حبیب چونکہ اصولی اور آئیڈل باتیں نہایت پختگی سے کیا کرتے تھے، وہ طلبا کی عام لیڈر شپ پر تنقید کرنے سے دریغ نہیں کیا کرتے تھے اور اپنے زمانے کی مسلم سیاست اور قیادت کے مسائل پر نہایت جچی تلی رائے رکھتے تھے اس لیے

ان کو یوں بھی فطری طور پر ممتاز طالبعلم لیڈر کی حیثیت حاصل ہونا ہی تھی۔ مگر علی گڑھ چھوڑنے کے بعد ان کی ساری قیادت بابری مسجد کے مسائل سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قیادت کی باگ ڈور حزب مخالف کے ہاتھ میں تھی اس لیے ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں'' کے مصداق ان کی قیادت ہمیشہ مشتبہ بنی رہی۔ جاوید حبیب اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے اعتبار سے قیادت اور رہنمائی کی صلاحیت کے مالک تو ضرور تھے مگر جیسا کہ عرض کیا گیا کہ وہ ہر معاملے میں کچھ اصولوں پر گامزن رہنا پسند کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ تو ان کا مزاج اپنے ہم عصر طلبا لیڈروں سے ملتا تھا اور نہ ملک وملت کی سطح پر قیادت کے دوسرے نمائندے ان کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ ان کے ساتھ کے وہ طلبا جن کو طلبا کی یونین میں صدارت اور سکریٹری شپ تو کیا محض کیبنٹ ممبر کے طور پر بھی انتخاب میں کامیاب ہونے کا موقع مل جاتا وہ دو تین برسوں میں ہی ریاستی حکومت یا مرکزی اقتدار کے حاشیہ نشینوں میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ مگر جاوید حبیب لگاتار دو تین سال تک یا تو الیکشن میں شکست کھاتے رہے اور جب کامیاب وکامران بھی ہوئے تو ان کے انداز اور مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ علی گڑھ سے دہلی یا لکھنؤ کے سیاسی حلقوں تک رسائی حاصل کرنے کے بجائے وہ مزید کئی سال تک علی گڑھ میں چند ذہین، شعری یا ادبی ذوق رکھنے والے یا سنجیدگی کے ساتھ اپنے زمانے کی صورت حال، سیاست، مذہب اور فکری سرگرمیوں سے دلچسپی رکھنے والے دوستوں کے ساتھ وقت گزاری کرتے رہے۔ ان کی محفلوں اور تبادلۂ خیال کا سلسلہ عام طور پر شام سے شروع ہو کر دیر رات تک شمشاد مارکیٹ کے ٹی ہاؤس میں چلا کرتا تھا۔ 'بوم کلب' کے نام سے ایک تصوراتی اور بوہمین نوجوانوں کی خودساختہ تنظیم کو وہیں فروغ ملا۔ اس نوع کے طلباء کی ذہنی تربیت بلکہ تربیت سے زیادہ رفاقت اور ہمت افزائی کنیڈی ہاؤس کے جنرل ایجوکیشن کے سینئر استاد ڈاکٹر احمد سورتی فرمایا کرتے تھے۔ دن میں کئی کئی گھنٹے ان کے ساتھ جاوید حبیب، فرحت احساس، آشفتہ چنگیزی، نذیر بوم، مہتاب حیدر نقوی اور ابوالکلام قاسمی بیٹھے اور آزادانہ تبادلہ خیال میں مصروف رہا کرتے تھے۔ وہاں یونیورسٹی کے شب و روز تو زیر بحث ہوتے ہی تھے، مگر معاصر فلسفہ، سیاسی صورت حال، مذہب، تقابل ادیان اور مشرق و مغرب کے نمائندہ مفکرین زیادہ زیر بحث رہا کرتے تھے۔ سارتر، کامیو، کرکے گار، مارشل ہائیڈگر، ہابس، لاک اور برینڈرسل وغیرہ سے متعلق مختلف سیاسی اور فلسفیانہ مباحث خواہ وہ وجودیت، رومانیت یا حقیقت پسندی، آواں گارد رجحان ہو یا علامت پسندی ہو یا مصوری اور موسیقی کے متعدد رجحانات رہے ہوں، ان سب پر لگاتار اور دھواں دھار گفتگو رہا کرتی تھی۔ آج غور کیجیے تو آسانی سے یقین نہیں آتا کہ طلبا کی سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں یا ان کی قیادت کے شوق میں سرگرم کار رہنے والے نوجوانوں میں کیا ابھی حال یا ماضی قریب میں بھی ایسے بعض طلبا لیڈر رہوئے ہیں جو فلسفہ، مذہب اور فکری مسائل سے ایسی گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے رہے ہوں جیسی دلچسپی جاوید حبیب کو تھی۔

جاوید حبیب نے اسی زمانے میں نثری نظمیں بھی لکھنا شروع کر دی تھیں۔ جو عرصے تک نظر انداز ہونے کے باوجود ان کی چھوٹی بہن کی کوششوں سے دہلی اردو اکیڈمی سے ''بے بس راستے''

کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ یوں تو جاوید حبیب کو بحیثیت مجموعی علم وادب سے دلچسپی غیر معمولی تھی مگر شاعرانہ مذاق وہ برائے نام ہی رکھتے تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں احمد ہمیش، خلیل مامون، اعجاز احمد، منیر نیازی اور شہریار کی نثری نظموں نے ایک ایسا ماحول بنادیا تھا جس پیٹرن کو جاوید حبیب نے بھی اختیار کیا۔ اس لیے ان کی نظمیں اگر بہت غیر معمولی نہیں تھیں تو معمولی بھی نہیں تھیں۔ ان میں شعریت کے بالواسطہ اظہار، تہہ داری اور جگہ جگہ دانش ورانہ غور وفکر کے افراط تھی۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نظموں کو نظرانداز تو بہرحال نہیں کیا جاسکتا۔

جاوید حبیب کی یاد دراصل ایک ایسے طالب علم لیڈر اور مثالی دوست کی یادوں کی بازیافت ہے جس کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں میں روایتی طور پر موجود لیڈرشپ کی صلاحیت کا آخری دور ختم ہوگیا۔ تقریباً تیس پینتیس سال کا عرصہ گزر گیا مگر اس پورے عرصے میں ایک تو لگاتار طلباء میں قیادت کی صلاحیت کو سیاسی اور انتظامی دباؤ میں رکھا گیا اور جب کبھی موقع دیا بھی گیا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی قیادت، صلاحیت، زبان وبیان اور دوراندیشی کے اسی بحران کا ثبوت ملتا رہا جو ہمارے ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کا مقدر ہے۔

☆☆☆

ایم.اے.او.کالج کی تعمیر میں غیر مسلموں کا تعاون

پروفیسر صغیر افراہیم

سرسید احمد خاں کے خوابوں کی تعبیر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ اِس کے تعمیری و تشکیلی مرحلوں سے دانشورانِ ادب واقف ہیں۔ یہاں محض صوبۂ پنجاب کے چند غیر مسلم حضرات کا ضمنی ذکر، وہ بھی سفرنامۂ پنجاب کے حوالہ سے کرنا چاہتا ہوں جن کے تعاون نے اِس ادارہ کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

سرسید احمد خاں کا سفرِ پنجاب (۲۲ر جنوری تا ۵ر فروری ۱۸۸۴ء) قومی جدوجہد کی ایک مختصر روداد ہے۔ اِس سفر کا بنیادی مقصد کالج کی تعمیر کے سلسلہ میں مدد، اپنے تعلیمی مشن کو فروغ دینا اور قوم کو جدید مغربی تعلیم کی جانب متوجہ کرنا تھا۔ 'دِلاورانِ پنجاب' نے بھی سرسید کے قافلہ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں اور دورانِ سفر سرسید نے بھی امیر، غریب، ہندو، مسلمان، اراکین آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا نیز اسکول و کالج کے لڑکوں سے ملاقاتیں کیں اور سب کا دل اپنی دردمندی اور حق گوئی سے جیتا اور اپنا پیغام علم و عمل دوسروں تک پہنچایا پروفیسر ہارون خاں شروانی جو ''سفرِ پنجاب'' کے اہم رُکن نواب اسمٰعیل خاں (رئیس دتاولی) کے بھتیجے تھے، وہ اپنے مضمون ''سید احمد خاں اور ہندو مسلم اتحاد'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مدرستہ العلوم مسلمانان'' یعنی (M.A.O. College, Aligarh) کے قیام کے بعد سب سے پہلا ایڈریس جو اس کالج میں کسی والیِٔ ملک کو دیا گیا وہ ایک سکھ مہاراجہ یعنی مہاراجہ سر مہندر سنگھ بہادر، فرماں روائے پٹیالہ کی خدمت میں تھا''۔

اُس ایڈریس میں سیّد والا گُہر نے کالج کے مُتعلق جس پالیسی کا اظہار کیا ہے وہ یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''اِس مدرسہ کے جو قواعد تعلیم قرار پائے ہیں ان کے مُوافق ہندو اور مسلمان دونوں اس مدرسے میں تعلیم پائیں گے۔ اس کے بانیوں کا مقصد ہندوستان میں علم و روشن ضمیری پھیلانے کا ہے اور اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمان برابر ترقی کریں اور علم و ہُنر سے فیض یاب ہوں۔''

مہاراجہ پٹیالہ نے جو جواب دیا اُس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اِس سوسائٹی کا یہ مقصد ہے کہ اہل ہند خواہ وہ کسی مِلت و مشرب کے ہوں اُن کو فائدہ پہنچے۔ اور مدرستہ العلوم کی تدبیر میں اس سے بھی عمدہ اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس میں تعلیم عُلوم عقلیہ کی بلا اختلاف مِلت و مذہب یکساں ہو...میری دانست

میں آپ بانیوں کی یہ دانش مندانہ تدبیر نہایت عمدہ ہے۔'' (تہذیب الاخلاق، جشنِ سرسید، ۲۰۱۷ء، خصوصی پیش کش-۱،ص:۸۷)

اس اتحاد و اتفاق کے تعلق سے برصغیر کی بات چھوڑیے محض صوبہ پنجاب کو سامنے رکھیں تو سرسید نے دورانِ سفر اَضلاع کے اعتبار سے پنجاب کے جن غیر مسلم حضرات کا انتہائی محبت سے ذکر کیا ہے اُن میں لدھیانہ کے منشی چتر سنگھ، منشی رام رچپال، سردار رچھپال سنگھ، لالہ دُرگا دت، لالہ کشور لعل اور لالہ امراؤ سنگھ اہم ہیں۔ جالندھر کے بابو لچھمن داس، پنڈت شیونرائن، بابو سلامت رائے، کنور ہرنام سنگھ اہلووالیہ، سردار بکرما سنگھ اور بھگت رام کے نام خصوصی طور پر شامل ہیں۔

اسی طرح امرتسر سے لالہ رام چندر، گوپی رام، نرائن داس، رام سنگھ، گنگا رام بخش اور لالہ بہاری کا سرسید نے بیحد شکریہ ادا کیا ہے۔ گورداس پور میں سردار شیر سنگھ، رائے رام داس، نرائن داس، منشی ٹیک چند، سردار پرتاپ سنگھ، رائے بوٹا مل، لالہ بشن داس، نرنجن لال، باوا گرم سنگھ، باوا پرتاپ سنگھ، باوا لچھمن سنگھ، بشمبھر ناتھ، نرائن سنگھ قابل احترام ہیں۔ پٹیالہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ سردار بسنتا سنگھ اور لالہ منسا رام کے بے حد ممنون و مشکور نظر آتے ہیں۔

لاہور کے تعلق سے سرسید نے مہاراجہ کپورتھلہ کی کوٹھی کا تفصیلی ذکر کیا ہے جہاں انھوں نے نہ صرف قیام کیا، بلکہ مُستقبل کے منصوبے بھی بنائے۔ لاہور میں جن غیر مسلموں کے وہ مشکور ہوئے اُن میں سردار دیال سنگھ، پنڈت ہرندر ناتھ، پنڈت امرناتھ، لالہ سنگم لال، لالہ رام کشن، ڈاکٹر برج لال گھوش، منشی گوپال داس، ششی بھوشن مُکھرجی، رام گوپال بوس اور پیارے لال وکیل اہم ہیں۔

MAO کی تعلیمی اور تعمیری سرگرمیوں کے پیشِ نظر سرسید احمد خاں نے برصغیر کے تقریباً تمام بڑے صوبوں کا دورہ کیا۔ اُن کے ہمراہ بغیر کسی تخصیص و تمیز کے وہ لوگ شامل ہوئے تھے جنھیں علی گڑھ تحریک سے اُنسیت تھی۔ ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی مل کر تعلیمی مشن کو کامیاب بنانے کے جتن کرتے اور چندہ دینے کی اپیل کرتے، اِس سلسلہ میں انھیں سب سے زیادہ مدد صوبہ پنجاب سے ہی ملی۔ اس دیار میں انھیں بیسیوں ایڈریس اور سپاس نامے پیش کیے گئے۔ اِن سے موصوف کی مقبولیت اور ان کی تعلیمی، تہذیبی اور فکری حکمتِ عملی کی قدر و قیمت ظاہر ہوتی ہے۔ ہارون خاں شروانی مذکورہ تحریروں اور تقریروں کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''شاید ان میں سب سے نمایاں وہ ایڈریس تھے جو ہندو مسلمانوں کے ملے جلے اداروں یا خالص غیر اسلامی اداروں مثلاً آریہ سماج کی طرف سے تھے اور جو خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اُن میں سے ہر ادارہ سید صاحب کی بے تعصبی اور ملی جُلی قومیت کے خیال کی داد دینے میں دوسرے پر سبقت لے جارہا تھا۔ پھر سید صاحب نے اُن سپاس ناموں کے جواب میں جو اصول پیش کیے وہ ایسے تھے کہ اگر انھیں آج کل کے زمانے میں بڑے سے بڑے قوم پرست بھی پیش کریں تو تعجب نہ ہوگا۔ چند مثالیں کافی ہوں گی:

۱- ''...جناب سید صاحب صرف ایک قوم یا ایک فرقے کے ہی مددگار نہیں بلکہ وہ جناب بابو کیشپ چندر سین اور شری سوامی دیانند سرسوتی کے ماننے والوں کو بھی اُسی نظرِ عنایت سے دیکھتے ہیں۔وہ خاص مسلمانوں ہی کے مُعاوِن نہیں بلکہ وہ کُل ملک کے مددگار، کُل ہندوستان کے جان نثار ہیں''۔

(ایڈریس طلبائے گورنمنٹ اسکول جالندھر)

۲-''...ایک اور اَمر جس کی طرف آپ کا صُلح کُل خیال ہمیشہ مبذُول رہا قابل شکرگزاری عامہ ہے:اور وہ اتحاد مابین ہر فرقۂ بشر اور خصوصاً ہندو اور مسلمان گروہانِ عظیم ہند کا ہے۔''

(سپاسنامہ، باشندگان گورداسپور)

اہم بات یہ نہیں ہے کہ غیر مسلموں نے دِل کھول کر چندہ دیا، سرسید کو سرآنکھوں پر بٹھایا بلکہ اُہم بات یہ ہے کہ انھوں نے سرسید اور رفقائے سرسید کو منظم طریقے سے تعصب، تنگ نظری اور قتل وغارت گری کے خلاف مورچہ قائم کرنے کی ترغیب دی اور حصولِ علم ودانش کی راہیں ہموار کیں۔ ہمت وحوصلہ کے ساتھ ساتھ مُیسر آنے والی آپسی قوت کی بدولت سرسید نے نہ صرف انسانی عمل اور اس کی بامعنی زندگی پر زور دیا بلکہ انسانی رشتوں میں جدید علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی بھی نشاندہی کی۔ نتیجتاً علی گڑھ تحریک نے جبر واستبداد، خوف اور تناؤ کے ماحول میں بھی خلوص وصداقت، قوتِ عمل اور بے لوث جذبہ ہمدردی کی وکالت کی اور عالمی سطح پر مُنافرت، رَقابت، کدورت اور رشک وحسد پر نشتر زنی کرتے ہوئے صُلح جوئی، باہمی رفاقت، مُساوات اور اتحاد کی نشاندہی کی جس کی ضرورت آج کے منظر اور پس منظر میں کافی شدّت سے محسوس کی جارہی ہے۔

☆☆☆

تبدیلی زندگی ہے
(تحمیض)

عابد رضا بیدار

مولانا آزاد نے کچھ ایسی بات کہی تھی کہ لوگوں سے ملنے جلنے میں، گفتگو کرنے میں، جگہوں اور اشخاص کی تبدیلی میں، زندگی زیادہ خوش گوار لگنے لگتی ہے۔ اقبال نے بھی کئی جگہ مختلف انداز سے اس بات پر زور دیا ہے کہ تغیر ہی زندگی ہے؛ تبدیلی سے زندگی میں امنگ آجاتی ہے۔

تبدیلی کا ایک اور محاذ بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ ابھی جاڑے کا موسم ہے، پھر گرمیاں آگئیں، پھر برسات آگئی، پھر از سرِ نو سردیاں شروع ہوگئیں۔ یہ بدلتے موسم بھی زندگی کو خوشگوار بناتے رہتے ہیں، حلقۂ احباب یا حلقۂ گفتگو میں افراد کی تبدیلی سے بھی مثبت اثر پڑتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ تبدیلی زندگی لاتی ہے۔

اس کے لئے مولانا آزاد نے تحمیض کا لفظ استعمال کیا ہے، اس تحمیض کی، ہم آپ ایک اور میدان میں آکر اپنے مذاق و مزاج کے مطابق تعبیر و تفہیم کر سکتے ہیں۔ ''ہم آپ'' سے مطلب پڑھنے لکھنے سے دلچسپی لینے والے صاحبوں سے ہے، اور اسی میدان میں گفتگو کو اور آگے چلائیں، تو تحمیض کی بات اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ:

ابھی غالب کی ایک غزل پڑھنے کے لئے مالک رام کا مرتبہ دیوان غالب اٹھایا، دس پانچ منٹ گزرے کہ یکا یک انڈین ایکسپریس میں اپوروانند کا مضمون سامنے آگیا، معاً بعد مہر پر قاضی مجاہد الاسلام صاحب کی تجویز سامنے آگئی کہ روپے کی قیمت تو گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، (بلکہ گھٹتی ہی ہے) اس لیے 'سکۂ رائج الوقت' کے بجائے، اگر جتنا مہر مقرر ہورہا ہے، اسے روپے کے بجائے اتنی رقم کا سونا مقرر کیا جائے تو آگے چل کے اگر روپے کی قیمت گھٹتی ہے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیوں کہ سونا تو اپنی جگہ برقرار ہی رہتا ہے۔

یہ تجویز پڑھ رہا تھا کہ ڈاکٹر اصغر عباس کی مرتبہ ''شذرات سرسید'' سامنے آگئی۔ ایک سمندر تھا افکار و آرا کا، گھنٹے گزر گئے: مولانا آزاد کا یہ تحمیض کا اصول بہت مزے کا لگنے لگا جب اپنے اوپر اس کا اطلاق ہوتے ہوئے دیکھا۔

وہ جو مصرعہ ہے ''ابھی کچھ ہے ابھی کچھ ہے ابھی کچھ''، اس فضول سے مصرعہ میں اوپر کی سطور کا پورا خلاصہ آگیا ہے۔

☆☆☆

جلال لکھنوی پر ڈاکٹر محمد حسن کے تھیسس کا جائزہ (غیر مطبوعہ)

قاضی عبدالودود

اردو ریسرچ کانگریس نے کبھی پی ایچ ڈی/ ڈاکٹریٹ کے تھیسیس کے جائزے شروع کیے تھے، ''معیار و تحقیق'' نے جائزوں اور اس کے جوابات پر مشتمل ایک خصوصی نمبر بھی شائع کیا تھا۔ قاضی صاحب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر اسی سلسلہ کی ایک یادگار ہے۔

میں نے آپ کی کتاب ''جلال لکھنوی'' توجہ کے ساتھ پڑھی اور اسے دلچسپ پایا، یہ خیال کہ یہ از سر نو لکھی جائے اور اس میں حسب ضرورت ترمیم و اضافہ ہو بہت اچھا ہے۔

(۱) کتاب کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے: باب اول میں دوسروں نے جلال کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخی ترتیب سے پیش کیا جائے، زوائد حذف کیے جاسکتے ہیں، اور اغلاط کی اپنی اپنی جگہ پر تصحیح ہوسکتی ہے۔ باب دوم میں جلال کے حالات زندگی تاریخی ترتیب سے ہونی چاہئیں، کسی واقعے کی طرف اس کی وقوع کے ذکر سے قبل اشارہ نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ تاریخ ولادت کی بحث میں سال وفات کا ذکر نہ آنا چاہیے اور یہ ناگزیر ہو تو یہ بحث حاشیے میں ہونی چاہیے، متن کتاب میں یہ کافی ہے کہ صحیح سال ولادت معلوم نہیں، قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ سنہ...... کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ جلال کے خاندان کا ذکر خود ان کی پیدائش کے ذکر سے قبل ہو، تصانیف کا مجمل بیان (مثلاً یہ کہ فلاں سنہ میں فلاں کتاب لکھی یا فلاں کتاب شایع ہوئی) اور معاصرین سے تعلقات کا حال بھی اسی باب میں ہونا چاہیے۔ موخر الذکر کے لیے ایک علیحدہ باب کی حاجت نہیں، اگر کسی واقعے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں تو اس زمانے کی قیاسی تعیین کرنی چاہیے، یہ کسی نہ کسی حد تک تو ہو ہی جائے گی۔ تیسرا باب تصانیف کے مفصل بیان کے لئے وقف ہونا چاہیے، دواوین کے ذکر میں تنقید بھی آسکتی ہے اور آپ چاہیں تو اس کے لئے ایک الگ باب بھی مخصوص کر سکتے ہیں، آخری باب میں کل دواوین کا الگ الگ انتخاب ہونا چاہیے۔

(۲) آپ نے بہت سے مآخذ سے کام نہیں لیا، اخباروں کی طرف تو بالکل توجہ ہی نہیں کی (تفاصیل آئندہ)۔

(۳) فہرست تصانیف میں دیوان ۴ کا ذکر ہی نہیں، یہ فروگذاشت کس طرح ہوئی سمجھ میں نہیں آتا، یہ بھی نہیں کہ دیوان پنجم کو دیکھنے کی بھی آپ نے کوشش نہیں کی، ممکن ہو تو اس کا مطالعہ ضرور کیجئے اور اس کا پتہ بھی لگائیں کہ تذکروں اور گل دستوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں یا نہیں، جو دواوین سے غیر حاضر ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ آپ نے کسی جگہ نظم نگاری کو دیوان ۳ اور کہیں دیوان ۴ لکھا ہے۔

(۴) ص ۴۰ میں رسالہ عروض و قوافی کے متعلق مرقوم ہے کہ ''اس رسالے میں صرف مختلف قوافی کی فہرست دی گئی

ہے''، اس عبارت کا مطلب میں نہ سمجھا، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں صرف قوافی سے بحث ہے، تو اس کا نام رسالۂ عروض وقوافی کیوں ہے؟

(۵) ص ۶۵ میں رشک کے کربلا جانے کا ذکر ہے، جلال کے دیوان اول میں اس سے متعلق ایک قطعۂ تاریخ ہے۔

(۶) ص ۱۶، میں ''مظفر حسین'' اسیر۔ یہ سہو قلم ہے، مظفر علی اسیر چاہیے، امداد علی ہجر (= بحر) طباعت کی غلطی ہے۔

(۷) یہ آپ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ اصغر علی قمر کے شاگرد تھے؟ مجھے اس میں بہت شبہ ہے، اصغر علی کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہیے، ''شمالی ہند کی اردو نثری داستانیں''، نامی کتاب میں ان کی کئی داستانوں کا ذکر ہے۔

ص ۱۷۵ وص ۱۷۰۔ آپ نے ایرج نامہ کے سوا کسی کا ذکر نہیں کیا، آپ کو ان کی عبارت کا نمونہ بھی دینا چاہیے۔

(۸) ص ۱۵۸ و ۱۵۹ میں ہے کہ ''جلال نے اپنے والد کی محنت کو...... داستان بالا باختر کی شکل میں جاری رکھا''۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ بالا باختر ایرج نامہ کے بعد کی داستان ہے، حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔

(۹) ص ۱۵۹، میں جو عبارت بالا باختر کی نقل ہوئی ہے اس میں یہ فقرے ہیں: ''جب ایرج نامہ کے اردو کرنے سے فرصت ہوئی...... بالا باختر رنگنے کے واسطے عنایت ہوئی''، اس سے تو مترشح ہوتا ہے کہ ایرج نامہ سے بھی جلال کا تعلق تھا، حقیقت کیا ہے؟

(۱۰) ایک ''بالا باختر'' نول کشور نے شایع کی ہے جو کوچک باختر کے بعد اور ایرج نامہ سے قبل ہے۔ جلال کی بالا باختر کا نولکشوری بالا باختر سے مقابلہ ضروری ہے، مقدم الذکر کے طویل اقتباسات بھی دینے چاہئیں کہ نثر نگار اردو داستان گو کی حیثیت سے جلال کا مرتبہ معلوم ہو سکے۔

(۱۱) سری رام اور آرزو کے اقوال (متعلق وفات جلال) میں کسے ترجیح ہے، اس کے فیصلے کے لئے اخباروں کی طرف رجوع کیا جائے۔ صحیح تاریخ وفات بآسانی معلوم ہو جائے گی۔ یہ امر بھی واضح رہے کہ سری رام کی خمخانۂ جاوید کی جلد ۲ کئی سال میں لکھی گئی ہے اور یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے جلال کی عمر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کیا تھا، یہ بات آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ وہ نہایت غیر محتاط مصنف تھے۔

(۱۲) ص ۳۰ ''میر ضامن علی جلال آہ آہ'' سے سال وفات ۱۳۲۴ سنہ نکلتا ہے''، یہ صحیح نہیں، اس سے سنہ ۱۳۲۷ متخرج ہوتا ہے۔

(۱۳) ص ۱۲ ''جلال ۲۵/۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے'' قطعیت کہاں سے آگئی؟ سال ولادت کی بحث بالکل اطمینان بخش نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ انتخاب یادگار میں بعض شعراء کا حال ۱۲۹۰ھ کے بعد لکھا گیا ہے، یہ دیکھئے کہ جلال بھی ان شعراء میں ہیں۔ یا مزید یہ کہ امیر نے عمر ''تخمینا نہیں لکھی''، آپ ''تخمینا'' کہاں سے لائے؟

(۱۴) ص ۱۸ میں عہد یوسف علی خاں میں جلال کے رام پور بلائے جانے، ۵۰ روپے ماہوار پر ملازم ہونے کے متعلق لکھا ہے کہ ''یہ واقعہ اواخر ۱۸۸۰ء یا اوائل ۱۸۸۱ء کا ہے''، اور ثبوت میں امیر کے خط مورخہ ۳/ جنوری ۸۱ء کی یہ عبارت پیش کی ہے: ''جلال آئے اور پچاس روپے مشاہرہ پر نوکر ہوئے'' امیر کی عبارت کا تعلق عہد یوسف علی خاں سے نہیں، عہد کلب علی خاں میں نوکر ہونے سے ہے اور مشاہرہ بھی وہی ہے جو کلب علی خاں نے مقرر کیا تھا۔ عہد یوسف علی خاں میں کیا مشاہرہ تھا، معلوم نہیں۔ واضح رہے کہ یوسف علی خاں ۱۸۸۰ء سے بہت قبل وفات پا چکے تھے۔

(۱۵) ص ۱۴۹ میں ہے کہ تنقیح اللغات کے خلاف جو رسائل شوق نیموی نے لکھے تھے "ذاتی مخاصمت اور جلال وتسلیم کے جھگڑوں کی بنا پر لکھے گئے"، یہ صحیح نہیں۔ تسلیم وجلال کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا، تسلیم اس قسم کے آدمی بھی نہ تھے کہ معاصرین سے جھگڑتے۔ ہوا یہ کہ شوق نے سرمۂ تحقیق "ازاحۃ الاغلاط" میں تنقیح اللغات کے بعض مطالب پر معترضانہ بحث کی۔ جلال کے ایک شاگرد نے اس کے رد میں ایک رسالہ لکھا (شوق کا بیان کہ خود جلال نے لکھا اس کی قطعی تردید ممکن نہیں)، اور پھر مناظرہ شروع ہوگیا، جس کا نہایت مفصل حال شوق کی "یادگار وطن" میں موجود ہے، یہ کتاب آپ کو کچھ دن کے لئے مستعار بھجوائی جاسکتی ہے۔

(۱۶) ص ۱۵۱ میں شوق کی جو عبارت نقل ہوئی ہے اس سے آپ کا دعوی کلا ثابت نہیں۔ یہ آپ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ "جلال نے جہاں کہیں ذاتی طور سے فیصلہ دیا اور اجتہاد کیا ہے وہ بھی انہیں (بہار عجم وغیاث اللغات) کی روشنی میں ہے"۔ آپ نے شوق کے احوال میں جو تضاد دکھایا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ بہار عجم وغیاث اللغات میں بہت سے اغلاط ہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ جلال نے ان اغلاط کا اعادہ کیا ہو اور ان دونوں کتابوں کا ۲ جگہ پر فیصلہ کرلیا ہو؟

میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا ہے۔ آپ تنقیح اللغات کو ڈھونڈ کر نکالیں اور جو کچھ لکھیں اس کے اور ازاحۃ الاغلاط سرمۂ تحقیق کے تقابلی مطالعے کے بعد! شوق کے اس اعتراض کا کہ بہار عجم کے لائے ہوئے اشعار کی بھرمار ہے، تتبع وتفحص کی تو ہوا تک نہیں لگی۔ فیصلہ بھی تنقیح کی طرف رجوع کئے بغیر نہیں ہوسکتا۔ شوق کا مطلب یہ نہیں کہ اسناد دوراز کار ہیں، وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اسناد فقط جلال نے ڈھونڈ کر نہیں لگائے، وہ کسی تعریف کے مستحق نہیں، اگر یہ واقعہ ہے کہ اشعار زیادہ تر وہی ہیں جو بہار عجم میں ہیں تو اعتراض صحیح ہے۔

پٹنہ، ۲۸/اپریل ۵۷ء

●

ماخذ کے متعلق: متاخرین کے کئی تذکرے ایسے ہیں جن سے آپ نے کام نہیں لیا اور اخبارات و رسائل کے بہت سے مضامین ہیں جو ظاہرا آپ کی نظر سے نہیں گذرے مگر مفید مطلب ہوسکتے تھے، تفاصیل آئندہ۔

(۱) "قبلہ گاہ من بہ فردوس آہ رفت" ۱۲۹۶ ص ۱۱۱ مگر اس سے ۱۲۹۱ مستخرج۔ ۱۲۹۶ بہ فردوس لکھنے سے نکلے گا۔ (۲) امید ہوگئی چہ ہر ایک مرد غریب = ۱۹۰۰، ص ۱۱۹ مگر اس مصرع سے ۱۸۰۴ برآمد ہوتا ہے، (۳) اردو کے محاورات اور مصطلحات میں سے کچھ تپش نے شمس البیان میں سے اسناد پیش کئے تھے۔ اور ان کا رسالہ چھپ بھی گیا ہے۔ اس کے بہت بعد نکہت دہلوی نے مخزن فوائد لکھی اور یہ بھی طبع ہوگئی ہے۔ اس کی ضخامت سرمایۂ اردو سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ ہوگی (اس وقت دونوں میں سے کوئی سامنے نہیں) اور اس میں اسناد بکثرت ہیں، "فرہنگ آصفیہ" پر کچھ تبصرے بھی کسی دوسرے نام سے "سرمایۂ زبان اردو" سے قبل شایع ہوچکے تھے اس میں "امیر اللغات" کے مولف کے متعلق یہ خیال کہ وہ سرمایۂ زبان اردو کے متعلم ہیں (ص ۱۳۹) درست نہیں، سرمایۂ زبان اردو کی بحث آپ کی کتاب میں بالکل ناکافی ہے۔ کتاب کے مطالب پر زیادہ گہری نظر ڈالنی تھی۔

پٹنہ، ۱۶/۵/۵۷ء

☆☆☆

گیان چند جین: ادب کی بارگاہ میں

ڈاکٹر شائستہ خان

ایک سی چیزیں پڑھتے پڑھتے، افسردہ سی ٹھٹھری ہوئی اس یکسانیت سے اکتا نہیں جاتے آپ؟ آپ کے قارئین نہیں اکتاتے ہوں گے، کیونکہ سارا ماحول ایسا بن چکا ہے۔ جس میں، نئی ڈگر، نیا طور، جھنجھوڑنا، جگانا، نئی وادیوں نئے جنگلوں کی تلاش، کسی نئی پگڈنڈی پر چلنے کا حوصلہ کیوں نہیں؟ ہوتا ہے تو اپیری سی ایشن (APPRECIATION) کیوں نہیں ملتا۔ اب دیکھئے یہ جو ہم نیا سلسلہ چھیڑ رہے ہیں، اسے کیا ریسپانس ملتا ہے!

''ہائیں! ادیب ہو کے سوچتی بھی ہو! مگر، بھائی، ادیب صرف اور محض ادیب ہی تو نہیں ہوتا اور زندگی کے مسائل سے اسے بھی اسی طرح واسطہ رہتا ہے جیسے غیر ادیب کو۔ اسے بھی ہر ہر جگہ ٹھٹھک ٹھٹھک کے سوچنا پڑتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ایسی سوچ کو ہمیشہ تحریر میں نہیں لایا کرتا، مبادا ادب کی بارگاہ میں بے ادبی سمجھی جائے''۔ محقق کبیر نے امریکہ سے روحانی طور سے ہمیں لکھا۔ پھر گویا یہ بھی لکھا کہ ''تاہم میں ایسی بے ادبانہ فکر بھی ضبط تحریر میں لاتا رہا ہوں۔ کچھ کو اردو کے ادیبوں نے ضرور پڑھا، خوب پڑھا، اور ایسا پڑھا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

ع تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا!''

ادیب کے لیے بڑا مشکل ہو جاتا ہے، محقق کے لیے اور بھی دشوار، کہ اپنی جانی پہچانی راہ پر چلتے چلتے ادب میں ایسی بے ادبی بھی کر گزرے کہ دو ڈھائی سطر میں ادب کو نبٹا کے باقی پوری تحریر غیر ادبی لکھتا چلا جائے اور تحریر بھی ایسی کہ اپنے کو بلا کم و کاست عیاں کرتا جائے۔ آگے، جو آپ ڈاکٹر گیان چند جین کی ایک تحریر ملاحظہ فرمائیں گے بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی تحریر ہے، ایک اہم دستاویز، اس امر کے لیے کہ لسانیات وادبیات اردو کا مایۂ ناز محقق محض شعر و ادب، داستان گوئی، اردو رسم الخط/لکھاوٹ، عروض و قوافی، طریق تحقیق و اصول تحقیق سے ہٹ کر کچھ سوچتا بھی تھا۔ زندگی کے مسائل، اردگرد کے ایشو، مذہب اور سماج اور خدا اور خدائی سب پر کچھ سوچ، کچھ فکر!

محقق کبیر نے ہمیں روحانی طور سے مزید یوں لکھا:

''میں ہوں گیان چند جین! اس گیان چند سے اردو دوست پہلے کبھی نہیں ملے تھے نا! مدت ہوئی یہ میری تحریر 'آج کل' والوں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی مگر اردو ادب کے موجودہ ریگزار میں پڑھنے والوں پر پوری طرح تو منکشف ہرگز نہیں ہوئی ہو گی۔ شائستہ نے، بھلا ہو اس کا، بھولی بسری اس ملواں تحریر سے اس حصے کو اقتباس کر لیا جو شاید ادب میں بے ادبی سمجھی جائے۔ چلو یوں بھی سہی! ادھر تو میرے او پر یوں بھی ہر قسم کے طعنے تشنے برس رہے ہیں، اب ایک اور یوں بھی رہے!''

تو جناب اب ملاحظہ ہو یہ نایاب تحریر جو آج کل کے غبار کارواں سیریز میں کبھی ادیب کی ادبی تحریر بن کے چھپی تھی، آج ادب کے ساتھ کچھ بے ادبی کے طور پر اس کا فکری بصرف فکری حصہ:

''اردو کے علماء میں مجھے قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی اور مولانا امتیاز علی عرشی نے بہت متاثر بلکہ مبہوت کیا ہے۔ یہ وہ عالم ہستیاں ہیں جن کی توصیف کی مجھے مجال نہیں۔ عرشی صاحب خدا معلوم کس قسم کے پٹھان ہیں، مرنجاں مرنج، زبان یا قلم سے کبھی کسی کے خلاف کوئی لفظ بھی نہیں کہا۔ کسی معترض کی بات کا بُرا مانا ہی نہیں۔ شاید یہ خان عبدالغفار خان کی قسم کے پٹھان ہیں۔ ان کے علم، سادگی، اور انکساری نے مجھے معتقد بنا رکھا ہے۔

دوسرے ابنائے وطن کے طرح اہل سیاست میں مجھے دو عظیم ترین ہستیوں مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے شدت سے متاثر کیا۔ میں مہاتما گاندھی کو اپنے دور کا سب سے بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔ وہ ایسے سنت تھے جن میں انسانیت اور ملوکیت سموگئی تھی۔ سیاست اخلاق اور پوری زندگی کو انھوں نے جو رفعت عطا کی وہ انھیں کا کام ہے۔ ملک کو آزادی دلانے میں جو حصہ ان کا ہے وہ کسی دوسرے کا نہیں۔ لیکن ان کے فلسفہ حیات سے میں متفق نہیں۔ میرے خیال میں ان کی سب سے بڑی ہار یہی ہے کہ خود ان کے ملک نے ان کے فلسفے کو نہیں اپنایا۔ پنج سالہ منصوبے گاندھیائی معاشیات کے مطابق نہیں۔ موجودہ حالات میں بھاری مشینوں کو رد کر کے دیہاتی خود کفالت کو اپنا لینا ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھاری صنعتوں کی تہذیب بھی تو بڑی جان لیوا ہے:

ع خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں!

میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے نوجوان، مہاتما گاندھی کے مقابلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات سے زیادہ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ جواہر لال میرے ہیرو ہیں۔ کاش وہ چند سال وزیر اعظم رہ کر عہدے کو تیاگ دیتے اور تصنیف و تالیف کی طرف لگ جاتے۔ وہ مفکر تھے۔ ان کے دیے ہوئے تمام اصول، جمہوریت، سیکولرازم، اور مذہب پر تعقل پسندی کو ترجیح دینا، میرے بھی آدرش ہیں۔ ان کا جدید مغربی ذہن مجھے ولولہ بخشتا ہے۔ گو مجھے اس سے انکار نہیں کہ ملک کے مدارالمہام کی حیثیت سے وہ مثالی یا مکمل نہیں تھے۔

متعدد واقعات ہیں جو مجھے متاثر کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک جنگ آزادی ہے۔ میں نے اس جنگ کا سب سے واضح منظر اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک میں دیکھا۔ میں اس زمانے میں الہ آباد یونی ورسٹی کا طالب علم تھا۔ ۲ر اگست ۱۹۴۲ء کو میں طلبہ کے ایسے جلوس میں شریک تھا جس پر پولیس نے گولیاں چلائیں۔ میری آنکھوں کے سامنے نوجوانوں کے گولیاں لگ رہی تھیں۔ پدم دھر سنگھ تو جان ہی سے جاتا رہا۔ میں نے یونیورسٹی کی عمارت میں گورے مجسٹریٹ کے حکم پر پولیس کو طلبہ پر لاٹھی چارج کرتے بھی دیکھا اور اس طرح شہنشاہیت سے کچھ اور نفرت ہوگئی۔ ایک قوم دوسری قوم پر بالجبر کیوں حکومت کرے۔ یہ اجتماعی خود غرضی بلکہ ٹھگی ہے۔

تحریک آزادی میں مجھے فرقہ وارانہ سیاست کے منفی کردار نے منفی طور پر متاثر کیا۔

دوسرے مذہب والوں کا قتل عام، لوٹ مار اور پھر فریق ثانی کی طرف سے اس کا اسی قسم کا جواب: بہیمیت کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ لوگوں نے آزادی کے معنی دوسرے فرقے کے قتل، غارت، زنا اور بہیمیت کی آزادی کے لیے! روحانیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس برصغیر میں ۱۹۴۷ء میں عورتوں اور بچوں پر جو مظالم ہوئے ہیں وہ

چنگیز اور ہلاکو کے فوجیوں نے خواب میں بھی نہ سوچے ہوں گے۔

کئی عوامل ہیں جنھوں نے مجھے مذہب سے بیزار کر دیا ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں مجھے ہندی کے مشہور شاعر ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن نے انگریزی پڑھائی۔ وہ کلاس میں کہا کرتے تھے کہ یہ صحیح نہیں کہ خدا نے انسان کو اپنے عکس میں ڈھالا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ انسان نے خدا کو اپنے عکس کے مطابق تخلیق کیا ہے۔ سیاسیات میں میں نے غالباً پرنس کروپاٹکن کا یہ زریں مقولہ پڑھا کہ ''مذہب زندگی کی افیون ہے۔'' ایک دوست ڈاکٹر رام نرائن مہروترا کے بقول مذہب انسانیت کے ساتھ سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ میں نے سماجیات میں بھی ایم اے کیا ہے۔ اس میں ایک پرچہ اینتھروپالوجی (بشریات یا علم الانسان) کا تھا۔ اس کی کتابوں میں صاف صاف یہ دکھایا گیا ہے کہ مذاہب قبائلی تصورات کی ارتقاء یافتہ شکل ہیں، یہ یکا یک وجود میں نہیں آگئے بلکہ آہستہ آہستہ ارتقا پا کر تشکیل پذیر ہوئے ہیں۔ جوش نے اپنی شاعری میں خدا سے جو بغاوت کی ہے وہ مجھے اتنا بھائی، ان کی نظم ''باغی روحوں کا کورس'' دل کو اتنی بھانے والی ہے کہ میرا بھی اس کورس میں شامل ہونے کو جی چاہتا ہے۔

دنیا کے بیشتر لوگ اپنے مذاہب کی صحت پر اس طرح اصرار کرتے ہیں کہ گویا انھوں نے عقل سے سوچ وچار کر اسے صحیح ترین پایا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ خاندانی ماحول کا اثر ہے۔ ۹۹ فیصدی سے زیادہ لوگ اسی مذہب کے پیرو ہوتے ہیں جس کے ان کے والدین۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے مذہب کو صحیح ترین ماننے میں تعقل کا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں جین گھرانے میں پلا ہوں۔ اس میں ایک خدا بلکہ فاعل خدا (یا فاعل دیوتاؤں) کا تصور نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہندوؤں یعنی سناتن دھرم میں وحدت نہیں تثلیث ہے۔ برہما، وشنو، مہیش (شیو)۔ اگر دنیا کے کارخانے کو کوئی غیبی طاقت چلا رہی ہے تو وہ شر کی طاقت ہے خیر کی نہیں۔ دنیا میں کتنی ناانصافی کتنا ظلم ہے۔ نیک تکلیف اٹھاتے ہیں اور بُرے عیش کرتے ہیں۔ نیچر کتنی نامعقول ہے۔ کہیں خشک سالی ہے تو کہیں سیلاب۔ سردیوں میں خواہ مخواہ بادل چھائے رہتے ہیں اور بارش نہیں ہوتی۔ یہ انسانوں کو اذیت دینا نہیں تو اور کیا ہے۔ خیر سے شر نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ بڑے بڑے بھونچال جو آتے ہیں تو کیا ان علاقوں کے سارے انسان چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت گنہ گار ہوتے ہیں جن سب کو سزا دینے کی ضرورت تھی ؟

لیکن میں الحاد کا نہیں تشکیک کا شکار ہوں۔ دنیا میں فوق فطرت واقعات دکھائی دیتے ہیں۔ بھوت کا وجود ہے۔ پچھلے جنم کا حال بتانے والوں میں کچھ نہ کچھ افراد سچے ہیں۔ محرم کے موقع پر بعضوں کا آگ کے شعلوں پر چلنا عقل پر عقیدے کی زندہ جیت ہے۔ اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ مہاراجہ نارائن سنگھ دیو سانپ کے کاٹے کو منتر سے ٹھیک کر دیتے ہیں۔ روح کا وجود ہے۔ حیات بعد ممات بھی ہے۔ کیا ہے یہ معلوم نہیں۔ ایک پردۂ ظلمات آگے تنا ہوا ہے۔ آنکھ دیکھ نہیں سکتی، عقل اسے پار نہیں کر پاتی۔

میں اعلیٰ اخلاق کی ضرورت سے منکر نہیں۔ مذہب ہی اخلاق کا سب سے بڑا پشت پناہ رہا ہے۔ مذہب کو چھوڑ کر اخلاقی اصولوں پر عقیدہ رکھنا بڑے بالیدہ ذہن ہی سے ممکن ہے''۔

☆

روحانی طور سے محقق کبیر نے ہمیں یہ بھی لکھا: ''یہ تحریر تو آخر آپ ادیب بھائیوں بہنوں نے پڑھ ہی لی۔ اب آپ کو

اختیار ہے جو سلوک چاہیں کریں۔ جس طرح گیان چند جین کے قلم ہاتھ میں ہے تو، جو جی میں آئے اپنے بارے میں، اپنے فکر کے بارے میں لکھنے کا پورا اختیار ملا ہوا ہے۔ اسی طور آپ بھی مختار کل ہیں؛ گیان چند پر لکھئے، اس کے فکر پر لکھئے۔ چھوڑئے گیان چند کو! اپنے فکر کی فکر کیوں نہ کیجئے! آپ میں سے کئی ایک صاحبان (پانچ سات کو تو میں ذاتی طور سے جانتا ہوں) ساری دنیا کے مسائل پر، ماورائے دنیا کے مسائل پر بھی، سوچتے ہیں؛ خوب سوچتے ہیں۔ لکھتے کیوں نہیں؟''

تو جناب! محقق کبیر کے اس چیلنج کو قبول کیوں نہ کریں!!

ہر ادیب کا، ادب سے ہٹ کے نہ سہی ادب کے متوازی ایک ذہنی سفر بھی چلتا رہتا ہے۔ کیوں نہیں لکھتے اس پر آپ! ساٹھ پینسٹھ سے اوپر پہنچ کر بھی نہیں لکھیں گے تو کب لکھیں گے؟ اور کیا چاہیے آپ کو؟ جو ملنا تھا مل گیا۔ اب جو وقت ہے اس میں دنیا کو کچھ دیتے جایئے: اپنے تجربوں کی، فکر کی، زکوٰۃ سہی۔

☆

ڈاکٹر گیان چند کے بارے میں ھماری ایک یاد داشت یا عرضداشت اوپر آپ کے ملاحظہ میں آچکی، اس میں کچھ ٹیلی پیتھی تھی، کچھ ادھر اُدھر کی باتیں۔ اب ھم نے ان کی، اپنی اور ان کے بارے میں لکھی، چند تحریروں سے، ایک خود نوشت مرتب کی ھے، الفاظ سب انھیں کے ھیں، عنوان سب ھم نے دئیے ھیں تاکہ مرکزی خیال واضح تر ھو جائے لیکن اس حقیر کوشش میں ھمارا تنہا مأخذ، کئی لحاظ سے ھندستانی اردو کے اھم ترین رسالہ شاعر بمبئی، ۱۹۸۱ء کا نمبر ۵-۶ ھے۔ "شاعر کی شکر گذاری کے ساتھ ھماری یہ ناچیز کوشش! آئیے، اس گیان چند سے ملیں: (ش)

مسلمین بالعمل:

''نام کا مسلمان کوئی ہوگا، کام و عمل کے مسلمان ہم ہیں''

ڈاکٹر گیان چند بہ روایت ڈاکٹر حکم چند نیّر: ڈاکٹر انصار اللہ، ('شاعر' ص ۱۹)

آسائش:

- آسائش اور دنیا کے مزے، مسرت اور طمانیت عطا کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔
- خواہشوں کی تکمیل ممکن نہیں، انھیں ترک کرنا ہی مناسب ہے۔
- بنیادی چیز ہے اخلاق، نیک چلن: عام آدمیوں کو مذہب کے بغیر نیکی کے راستے پر چلانا ممکن نہیں۔ زیادہ پڑھے لکھے اور گنے گڑھے ہی مذہب کے بغیر بھی راہ راست پر چل سکتے ہیں۔
- مذہب اگر ایک سراب ہو تو بھی عام آدمی کے لیے اس کا نعم البدل نہیں۔
- بہترین مسلک و مشرب یہ ہے کہ دوسروں کی تکلیف اور رنج میں اضافہ نہ کرو؛ اگر دوسروں کی خوشی میں اضافہ کر سکو تو کیا کہنا۔

فرد سے نہیں، غلطی سے، پرخاش:

میں نے بعض ایسے بزرگوں کی تحقیق سے اختلاف کیا ہے جن سے مجھے سب سے زیادہ عقیدت ہے مثلاً مسعود حسن رضوی مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود۔ لیکن میں نے احترام کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا کیونکہ یہ وہ حضرات ہیں جن

کے بر ہمن کے آگے سربہ سجود ہونے کو جی چاہتا ہے۔ قاضی صاحب نے بہتوں کی غلطیوں پر گرفت کی ہے۔ لیکن ان کے بارے میں کوئی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ انھیں اپنے ہدف سے کسی قسم کی پرخاش ہے۔ انھیں فرد سے نہیں غلطی سے پرخاش ہے۔

اردو ہندی ہندستانی:

میں مردم شماری میں اپنی زبان اردو لکھتا ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میری ماں بلکہ والد بھی اردو نہیں پڑھتے تھے۔ یہ صورت حال پنجاب تک تھی۔ یو۔ پی میں بول چال کی حد تک اردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں۔

لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہیں۔ میرے مجموعے ''حقائق'' میں مضمون ''اردو ہندی یا ہندستانی'' ملاحظہ ہو۔ ادب میں جا کر اردو اور ہندی میں علاحدگی کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اردو صرف کھڑی بولی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، برج بھاشا اودھی وغیرہ اردو نہیں۔ دکنی کو بھی میں کھڑی بولی کی ایک شکل مانتا ہوں۔ پھر، ہر کھڑی بولی اردو نہیں۔ اردو اور ہندی میں فرق کرنے کو یہی تو کہا جاتا ہے کہ اردو میں عربی فارسی الفاظ ہوتے ہیں ہندی میں سنسکرت الفاظ۔ آپ نے نورس کے اقتباس دیکھے ہیں؟ وہ بیشتر برج بھاشا میں ہیں اور ان میں سنسکرت کا غلبہ ہے... کچھ دیانت چاہیے۔ کیا یہ اردو ہے؟ کیا یہ صرف اس لیے اردو ہے کہ اسے ایک مسلمان نے لکھا ہے؟ تو پھر ملک محمد جائسی کی پدماوت، منجھن کی مدھ مالتی، عثمان کی چتراولی وغیرہ کو بھی اردو کہہ دیجیے۔

ہندو ہونے کے باوصف!

اگر مجھے دوبارہ جنم ملے!

اردو کے علاقے میں رہنے والے بہت سے ہندو اردو کو Disown کر کے ہندی کو اپنا چکے ہیں۔ وہ اردو بولتے اور لکھتے بھی ہیں تو بھی اسے ہندی کا نام دیتے ہیں۔ اس صورت حال میں مجھ جیسے لوگ جن کا اوڑھنا بچھونا، ہندو ہونے کے باوصف، اردو ہے......

لیکن مجھے اردو سے وابستگی پر ملال نہیں۔ اگر مجھے دوبارہ جنم ملے اور اپنے موضوع تعلیم کے انتخاب کا موقع دیا جائے تو میں پھر اردو زبان وادب کا انتخاب کروں گا۔ [مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں ہندو ہوں یا نہیں، مردم شماری میں جینی ہندوؤں سے علاحدہ دکھائے جاتے ہیں]۔

میری کم نظری کی چند مثالیں:

دوسروں کی تحقیق، اپنے حصے میں

- قصہ چار درویش کا ایک فارسی نسخہ میر احمد کا مولفہ ہے مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی دونوں یہ سمجھا کئے یہ باغ و بہار پر مقدم ہے اور اس کے مآخذ میں سے ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب ممتاز حسین نے باغ و بہار مرتب کر کے کراچی سے شائع کی تو اس کے دیباچے میں انکشاف کیا کہ میر احمد نے باغ و بہار کو سامنے رکھ کر اس کے بعد فارسی نسخہ مرتب کیا۔ چنانچہ میر احمد کے مطبوعہ ایڈیشن میں باغ و بہار کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے ۱۹۶۴ء میں ایک مضمون لکھا جس میں یہی انکشاف کیا لیکن ممتاز حسین کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ میں نے اردو کی نثری داستانیں طبع دوم میں اس دریافت کو عظیم الشان سے منسوب کیا کیونکہ اس وقت تک میری نظر سے ممتاز حسین کا نسخہ نہیں گزرا تھا۔
- **مثنوی گلزار نسیم** کے سلسلے میں کسی رفعت کی ایک فارسی مثنوی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ رفعت نسیم سے بعد کا شاعر ہے۔ مجھے رفعت کا نام معلوم نہ تھا۔ معراج دھول پوری

صاحب نے ہماری زبان کے ایک مضمون میں واضح کیا کہ رفعت کا نام میکولال کائستھ تھا نیز اس کا اور اس کے استاد نذیر کا ذکر سید علی حسن خاں کے تذکرہ صبح گلشن میں ہے۔ معراج صاحب کی نشان دہی پر میں نے یہ تذکرہ دیکھا اور اس کے حوالے سے اپنی کتاب میں رفعت کا نام درج کیا۔ افسوس کہ میں نے کتاب میں اعتراف نہیں کیا کہ تذکرہ صبح گلشن میں رفعت کے حالات کی نشان دہی معراج صاحب نے کی تھی۔ (ص ۳۸)

● میں نے ڈی لٹ کے لیے اردو مثنوی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر آگرہ یونیورسٹی میں پیش کیا۔ اس کے ممتحنین میں کلیم الدین احمد بھی تھے۔ انھوں نے میرے مقالے کو ترمیم کے لیے واپس کر دیا۔ منجملہ دوسرے اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ ''تاریخی پس منظر میں مقالہ نگار نے بہت کچھ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب میر تقی میر، حیات اور شاعری سے لیا ہے، اصل حوالے نہیں دیکھے، مثلاً فریزر کی انگریزی کتاب تاریخ نادر شاہ سے جو اقتباس دیا ہے وہ ڈاکٹر فاروقی کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے۔'' اعتراض صحیح تھا۔ چند سال تک میں کلیم الدین صاحب سے آزردہ رہا اور اپنی ایک آدھ تحریر میں ان کے خلاف کوئی سخت جملہ لکھ دیا۔ یہ نامناسب تھا۔

● ۱۹۴۶ء میں داستانوں پر تحقیق کرتے وقت میں مسعود حسن رضوی مرحوم سے ملا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ نوطرز مرصع کے مصنف تحسین کا صحیح نام محمد حسین عطا خاں تھا نہ کہ محمد عطا حسین خاں، جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے۔ میں نے 'نثری داستانیں' میں یہ بات لکھی۔ خیال تھا کہ میں نے مسعود صاحب کا حوالہ دیا ہوگا، کتاب نکال کر دیکھا تو ان کا ذکر خیر نہ تھا۔

● مثنویوں کی تحقیق کے دوران میں نے مسعود صاحب کے یہاں ناسخ کی مثنوی سراج نظم دیکھی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اس کا نام 'نظم سراج' نہیں جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے بلکہ سراج نظم ہے اور مثنوی کے بعض اشعار سے اس کا ثبوت دیا۔ میں نے اپنی کتاب میں یہ انکشاف کیا ہے۔ اس مضمون کو لکھتے وقت متعلقہ بیان دیکھا تو اس میں مسعود صاحب کا کوئی اعتراف نہ تھا۔ یہ معمولی سی فروگزاشتیں تحقیقی بد دیانتی ہیں۔

● میں نے مسعود حسن رضوی صاحب کے مرتبہ رزم نامہ انیس کے بارے میں لکھا کہ بعض معترضوں کے مطابق مسعود صاحب نے کلام انیس میں ذاتی مداخلت وتصرف کر کے اپنی موزونی طبع سے پیوند کاری کی ہے۔ رام پور کے نجم الدین نقوی صاحب نے کسی سے زبانی گفتگو میں کہا کہ ''معلوم ہوتا ہے گیان چند نے رزم نامۂ انیس کا مقدمہ نہیں دیکھا۔ اس میں مسعود صاحب نے خود ترمیم کاری کا اعتراف کیا ہے''۔ نقوی صاحب کی بات صحیح تھی۔ میں نے جب متعلقہ مضمون لکھا تھا مجھے جموں میں رزم نامۂ انیس نہ مل سکا تھا، بہت پہلے دیکھا تھا لیکن مقدمے کو نہ پڑھا تھا، اور یہ اعتراض نائب حسین نقوی صاحب کے ایک مضمون سے لیا تھا۔

● میں نے رسالہ معاصر قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء میں قاضی صاحب پر مضمون میں لکھا کہ ان کی کتابوں میں غلط نامے ضرور ہوتے ہیں۔ ان کی مرتبہ ''قاطع برہان اور رسائل متعلقہ'' کی تصحیح چونکہ مالک رام اور رشید حسن خاں نے کی اس لیے یہ جلد غلط نامے سے مبرّا ہے۔ فروری ۱۹۷۹ء میں پٹنے میں قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے کہا کہ ''اس کتاب میں بھی اغلاطِ طباعت ہیں۔ صراحت کر دی گئی ہے کہ غلط نامہ اور حواشی دوسری جلد میں ہوں گے۔'' بعد میں' میں نے اس کتاب کا مقدمہ دیکھا تو واقعی اس میں یہ صراحت تھی کہ غلط

نامہ دوسری جلد میں ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ جلد ابھی تک شائع ہی نہیں ہوئی غلط نامے کی ناگزیری کا اعتراض دراصل مجھ پر پھبتا نہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۶۹ء میں میری کتاب ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' شائع کی تو جلد بندی سے پہلے مشین پروف میرے پاس بھیجے۔ اگر مجھے دکھانا ہی تھا تو کتابت شدہ کا پیاں دکھاتے۔ مطبوعہ اوراق اغلاطِ طباعت سے لبریز تھے۔ میں نے ایک طویل غلط نامہ تیار کیا جو کتاب کے آخر میں زیب دے رہا ہے۔ اسی لیے میں نے انتساب میں اس جلد کو صحیفۂ اغلاط کہا ہے۔ چلیے اس کتاب کی اغلاطِ طباعت کی ذمے داری مجھ پر نہیں کیونکہ ناشر ایک وقیع ادارہ تھا۔ میں نے تادمِ تحریر اپنی صرف ایک کتاب 'حقائق' خود چھاپی ہے۔ الہ آباد میں میرے ایک رفیق کار نے اس کی طباعت اور پروف کی تصحیح کی۔ وہ ایک قابل استاد ہیں اس لیے میں نے ان کی تصحیح پر بھروسہ کیا۔ کتاب چھپ کر اور جلد بندھ کر آئی تو اس کی غلطیاں دیکھ کر میں ششدر و مبہوت ہو گیا۔ اس کے لیے جو غلط نامہ تیار کیا وہ ''اردو مثنوی'' سے بھی طویل تر تھا۔ اس طرح اردو کی جملہ کتابوں میں میرے علم کی حد تک میری دو کتابوں 'اردو مثنوی' اور حقائق میں سب سے زیادہ گراں ڈیل غلط نامے ہیں۔ میں قاضی جی کے سامنے ایسا چور بنا کہ ''حقائق'' کی جلد انھیں گزراننے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔

● میں نے اپنے ایک مضمون ملا رضی تبریزی کی فارسی نثر حدائق العشاق کو مثنوی فرض کیا ہے۔ میں نے یہ کتاب کب دیکھی تھی، فتاحی کی نورالعشاق کے وزن پر قیاس کر لیا کہ یہ بھی مثنوی ہوگی۔ ٹھوکر کھائی اور پکڑا گیا۔ ڈاکٹر نیّر مسعود نے اپنے تحقیقی مقالے میں تصحیح کی۔ چونکہ اردو کی نثری داستانیں کے دوسرے ایڈیشن میں میں نے دکنی داستانیں بھی شامل کر لی ہیں اس لیے اس میں بھی یہ غلطی در آگئی۔ متن چھپ چکا تھا۔ کتاب کے آخر میں میں نے تصحیح کی۔ جلی عنوان سے نیّر صاحب کے حوالے سے اپنی غلطی کا اعلان کیا۔ یہی غلطی اردو مثنوی میں بھی ہے۔

● صفیر بلگرامی نے بوستان خیال کی اردو میں تلخیص کی تھی۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی کی کتاب 'صفیر بلگرامی' طبع ۱۹۷۶ء سے معلوم ہوا کہ رسالہ اردو کراچی بابت جنوری ۱۹۶۶ء میں ظفر اوگانوی نے صفیر کی خودنوشت سوانح اپنے تعارف کے ساتھ چھاپی ہے۔ میں نے کتاب کی طبع سوم میں اس خودنوشت سوانح سے فائدہ اٹھایا ہے۔ رسالہ اردو میرے پاس آتا تھا جس میں جنوری ۱۹۶۶ء کا شمارہ بھی شامل تھا لیکن اتفاق سے میں نے توجہ نہ کی تھی کہ اس میں صفیر کی سوانح دی ہے۔

....

تحقیق میں دوسروں کی بے احتیاطیوں کی چند مثالیں:

رشید حسن خاں:

معترضانہ تحقیق میں قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں سرفہرست ہیں۔ قاضی صاحب نے بہتوں کی غلطیوں پر گرفت کی ہے۔ لیکن ان کے بارے میں کوئی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ انھیں اپنے ہدف سے کسی قسم کی پرخاش ہے، انھیں فرد سے نہیں غلطی سے پرخاش ہے۔ لیکن رشید حسن خاں جب مالک رام صاحب کی اغلاط کی نشان دہی کرتے ہیں تو ان کا لہجہ کسی جذبۂ پرخاش کی غمازی کرتا ہے۔

مالک رام سے متعلق فرضی نام سے جو ایک کتاب ''اردو تحقیق اور مالک رام'' شائع کی گئی اس کے بیشتر مضمون نگار (اصلی اور فرضی) مالک رام کے سامنے طفل مکتب ہیں لیکن وہ پاس ادب ملحوظ نہ رکھ سکے جو اردو تہذیب کی خصوصیت ہے۔ اس

میں ذاتی حملوں کی یہ کیفیت ہے کہ مرتب نے ان میں یہ عیب بھی ڈھونڈ ھا ہے کہ وہ معاش کے لیے ایک تجارتی ادارے سے وابستہ ہیں۔ لکھتے ہیں: ''ہمارے اچھے محقق مثلاً شیرانی صاحب، قاضی صاحب، عرشی صاحب ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر مسعود حسن رضوی (وغیرہ) کو دیکھیے، ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گزار دی اور ہر پھر کے علمی دائروں ہی میں قدم رکھتے رہے۔ یہ لوگ یہ نہیں کر سکے کہ ایک وقت میں ستر کاموں میں حصے داری کی جائے اور علمی و غیر علمی کاموں میں برابر سے حصہ لیا جائے۔ ادھر ٹانگ اڑائی، اُدھر ہاتھ پھیلایا، اس طرف ایک تجارتی ادارے میں دخیل ہوئے، اس طرف ایسے ہی کسی اور دائرے میں گردش کرنے لگے اور مطلب ساری دادودہش کا فقط یہ ہوا کہ ہر طرف سے یافت ہوتی رہے اور 'دستِ غیب' برقرار رہے۔'' اشارہ ہے مالک رام صاحب کے جالندھر موٹر ورکس کا ڈائرکٹر ہونے کی طرف۔ اوپر جن محققوں کے نام درج کئے ہیں ان میں سے قاضی صاحب کے علاوہ بقیہ سب معاش کے لیے ملازمت کرتے تھے۔ مالک رام بھی جب تک ملازم رہے انھوں نے تجارت نہیں کی لیکن ریٹائر ہونے کے بعد کسبِ معاش کے لیے ایک تجارتی ادارے سے اس طرح منسلک ہو گئے کہ انھیں اس میں کوئی وقت نہیں دینا پڑتا۔ کیا جو اشخاص غیر علمی پیشوں میں ہیں ان کے لیے علمی کام ممنوع ہیں؟ سر ولیم جونز اور گریرسن، آئی سی ایس کے غیر علمی شعبہ میں رہ کر کیا کیا کارنامے کر گئے، کالی داس گپتا رضا دنیوی حیثیت سے بڑے متمول تاجر ہیں، ان کے لیے تحقیق کرنا عیب ہے کہ موجب تحسین ہے؟ کیا علمی کام کرنے والوں کو رجب علی بیگ سرور اور غالب کی طرح اہل جاہ کے آگے ہاتھ ہی پھیلائے رکھنا چاہیے یا اپنے زور بازو اور کس بل سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ کو ان کے بارے میں لکھنا پڑا کہ ''اس معاملے کا افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ اکثر حضرات جنھوں نے رشید حسن خاں کے یہ تبصرے پڑھے ہیں ان کی نیت پر بھی شک کرتے ہیں۔ انھوں نے اکثر و بیشتر ان مضامین میں طنز و تمسخر کے تیر و نشتر چلائے ہیں جس کا ردعمل خوشگوار ہو ہی نہیں سکتا۔ میری رائے میں اعتراض کو مشورے کی شکل میں آنا چاہئے تاکہ دوستانہ فضا میں بات کو سنا بھی جا سکے اور اس کے زیر اثر آئندہ کوئی مثبت نتیجہ بھی نکل سکے''۔ میری عرضداشت یہی ہے کہ معترض کی نیت شک سے بالاتر ہونی چاہیے نیز خوردہ گیری اور عیب جوئی کبھی کبھی ٹھیک ہے لیکن اسے اپنا پیشہ نہ بنائیے۔ اپنی طرف سے کچھ مثبت کام بھی کیجئے۔

ڈاکٹر حنیف نقوی:

حنیف احمد نقوی جب بھوپال میں پڑھتے تھے یا شاید اس کے کچھ بعد، انھوں نے دلّی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے مرتبہ ایک دیوان کی فاش غلطیاں مجھے دکھائیں لیکن ضبطِ تحریر میں لانے سے اس لئے پیچھے ہٹ گئے کہ معلوم نہیں فاضل مرتب سے کس سلیکشن کمیٹی میں سابقہ پڑ جائے۔ تعلیمی درس گاہوں میں یہ جو لکچرار اور ریڈر ہم پروفیسروں کی قدردانی میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اس میں ۷۵ فی صد ہاتھ ممکنہ سلکشن کمیٹیوں کا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ :

میں نے خسرو شناسی (اکتوبر ۷۵ء) کے لئے ایک مضمون لکھا ''کھڑی بولی کے ارتقاء میں امیر خسرو کا حصہ'' اس مضمون کا مسودہ پانچ چھ مہینے تک ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے پاس پڑا رہا۔ انھوں نے بھی اسی موضوع پر مضمون لکھا ''امیر خسرو کے ہندوی کلام پر استناد کا مسئلہ۔'' انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ میرے

''مضمون کے مسودے کو پڑھ چکے ہیں''۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ ان کے مضامین میں میرے مضمون پر کئی اضافے ہیں۔ تحقیق میں کوئی زمیندار زمینوں کو یوں نہیں اٹھا سکتا کہ دوسروں کے لیے گنجائش ہی نہ رہے۔

شیعہ تحقیق:

اپنے فرقے یا گروہ کی بے جا حمایت اور دوسرے فرقے یا گروہ کی مخالفت! معاملہ بہت نازک ہے لیکن میں جگر داری سے کام لے کر مثالیں دوں گا۔ آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ حکیم قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ مرزا مظہر جانِ جاناں کو مارنے والا کوئی سنّی تھا۔ چونکہ آزاد شیعہ تھے اس لیے انھوں نے شیعہ قاتل کے سر سے یہ الزام دور کرنے کے لیے قاسم کی سند لکھ دی۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون ''آزاد بحیثیت محقق'' میں اس الزام کی قلعی کھولی ہے۔ میرے سامنے اس وقت قاضی صاحب کا مضمون نہیں لیکن مجموعۂ نغز میں دیکھتا ہوں تو یہ کہیں نہیں لکھا کہ مرزا مظہر کا قاتل سنّی تھا۔ مرزا مظہر پر جو شیعوں پر تعریض کا الزام تھا، اس کی مدافعت میں قاسم نے لکھا کہ مظہر تو حبِّ علی کے اشعار بھی لکھتے تھے۔ چونکہ آزاد مسعود حسن رضوی صاحب کے فرقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے رضوی صاحب خواہی نخواہی ہر جگہ آزاد جیسے فسانہ طراز کو معتبر محقق منوانے کا بیڑہ اٹھائے رہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہوسکتا کہ مسعود حسن رضوی صاحب کے تمام ہیرو شیعہ ہیں۔ شاید وہ غیر شیعہ پر لکھنا ہی نہ چاہتے تھے انیس، محمد حسین آزاد، واجد علی شاہ، امانت لکھنوی، فائز دہلوی، میر تقی میر وغیرہ سب انھیں کے فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بعض مضامین ضرور غیر شیعوں پر لکھے ہیں لیکن ان کے ہیرو اور ممدوح سب شیعہ ہیں۔

مسعود صاحب مصر تھے کہ فائز شمالی ہند کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کا مسلک ہے کہ نہ صرف شاہ حاتم بلکہ آبرو، مضمون دیکرنگ (چاروں سنّی) نے بھی فائز سے پہلے اردو میں شعر گوئی کی ابتدا کی۔

ہندو تحقیق/مسلم تحقیق:

تحقیق سے اپنے فرقے یا گروہ کے خلاف کوئی بات بر آمد ہو تو اسے نہ دبائیے!

کالی داس گپتا رضا کا موقف ہے کہ چھنّو لال دلگیر آخرِ عمر تک ہندو رہے، مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کا اصرار ہے کہ وہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ کالی داس صاحب کا کہنا ہے کہ قاضی عبدالودود ان کے موقف کو درست سمجھتے ہیں اور قاضی صاحب جیسے کھرے محقق کی بات پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک ضعیف روایت ہے کہ بینی نراین جہاں آخر عمر میں مسلمان ہو گئے تھے۔ قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر حنیف احمد نقوی اس کو قبول نہیں کرتے۔ قاضی صاحب تو خیر سے مذہبی علائق سے بہت بلند ہیں۔ حنیف احمد نقوی نے بینی نراین جہاں پر اپنے مضمون میں دلگیر کی تبدیلیٔ مذہب کو تسلیم اور بینی نراین کی تبدیلیٔ مذہب سے انکار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں مقامات پر مصنف کی اپنے فرقے سے وابستگی کا کوئی دخل نہیں۔

☆☆☆

اپروانند

اسلاموفوبیا: ہمارا اور ان کا رویہ

مترجم: ڈاکٹر معید الرحمٰن

نیوزی لینڈ کے کرائسٹ چرچ میں انسانی قتل نے یوروپی ممالک کو اپنے احتساب کے لیے مجبور کردیا ہے۔ اہل نیوزی لینڈ اس بات سے پریشان ہوگئے ہیں کہ اس طرح کا وحشت ناک عمل کس طرح اور کیوں کران کے ملک میں وقوع پذیر ہوا۔ آسٹریلیا میں جو اس ملزم کا وطن ہے وہاں مسلمانوں کے بارے میں خصوصاً اور دیگر تارکین وطن کے بارے میں عموماً بڑھتے تشدد اور نفرت کے واقعے پر غور و خوض کی دعوت دی جا رہی ہے۔ یہ اس بات کی نشان دہی ہے کہ یہ انسانی قتل نتیجہ ہے اسلاموفوبیا کا جو عام انسانی زندگیوں، اداروں اور میڈیا میں پھیل رہا ہے۔

اسلاموفوبیا کے عواقب کو تسلیم کرنے کے بعد یہ نہایت دل چھو لینے والے واقعات پڑھنے میں آئے کہ عالمی سطح پر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرف سے اہل مساجد کو خیر سگالی کے طور پر گلدستے پیش کیے جا رہے ہیں۔ سنگاپور کا واقعہ ہے کہ وہاں نیوزی لینڈ کے مقیم باشندے مسلمانوں سے اظہار ہمدردی کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ صرف اس مرتکب کے ذریعے پیش کردہ ۷۴ صفحے پر مشتمل منشور کی تردید کافی نہیں بلکہ اس تردیدی رویے سے شدید ہم آہنگی کا اظہار لازمی ہے۔

آپ نیوزی لینڈ کے وزیراعظم کے چہرے پر درد کا خلوص اور اظہار تکلیف میں جلدی کا مظاہرہ کرنے کو محسوس کرسکتے ہیں۔ انھوں نے آسٹریلیائی سینٹر کے خلاف کارروائی کرنے کی حمایت کی ہے، جنھوں نے مظلومین پر سارا الزام تھوپ دیا۔

اب جہاں تک معاملہ ہے ہندوستان کا جو دنیا کی مسلم آبادی کا دوسرا بڑا مسکن ہے۔ وہاں اس طرح کے اقدامات دیکھنے کو نہیں ملتے ہیں۔ جہاں مسلمان قتل کیے جا رہے ہیں لیکن وہاں کسی ہم وطن نے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ جہاں حکومت یا سیاسی جماعتوں سے ان کے پسماندگان کے ساتھ شریک ماتم ہونے کے بارے میں امید کرنا بالکل غلط ہے۔ ہم بیرون ممالک سے لائی ہوئی ان کی کرنسی قبول کرتے ہیں لیکن ان کے نقصان میں حصہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

میرا ذہن ان حملوں کی طرف گیا جو مالیگاؤں، مکہ مسجد اور اجمیر شریف کے مساجد میں ہوئے۔ اس وقت قوم نے ان پر کس طرح اپنے ردعمل کا اظہار کیا اور سرکار کا کیا رویہ تھا اس سے ہم سب واقف ہیں۔ الیکشن کے موقعوں پر یہ مسجدیں خبروں میں مختلف وجوہ سے ہیں۔ دہلی میں بی جے پی نے الیکشن کمیشن سے یہ درخواست کی کہ خاص طور پر مسلم آبادی والے علاقوں کی مساجد پر نظر رکھنے والے مقرر کیے جائیں تاکہ کچھ سیاسی اور مذہبی افراد مذہب کے حوالے سے الیکشن کو متاثر کرنے کے لیے نفرت نہ پھیلا سکیں۔ اس خبر سے کوئی خلفشار نہیں پھیلا۔ عآپ پارٹی کے علاوہ کسی سیاسی پارٹی نے مسجد کو ایک مشتبہ مقام قرار دینے کے بیان کی گرفت نہیں کی۔

مغرب میں کچھ لوگ اس کام کے لیے متعین ہیں جو مستقل ہر شکل میں اسلاموفوبیا کی شناخت میں مصروف ہیں اور اس رویے کو فروغ دینے والوں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ہم لوگ اسے اتنے معمولی انداز میں لیتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان اس کے خلاف شکایت کرتا ہے تو اسے غیر ضروری طور پر حساس کہا جاتا

ہے۔اسکولوں میں مسلم بچوں کا مذاق اڑانے اور انھیں زدوکوب کرنے کی مثالیں تونسلوں سے منتقل ہوتی آ رہی ہیں۔ایک شخص جو ۰ے سال کے ہیں وہ مجھ سے کہنے لگے کہ کیسے انھیں ۶۸ سال قبل مسلم ہونے پر اسکول میں ان کے ہم جماعت ساتھیوں نے پریشان کیا۔

پچاس سال کی عمر کے ایک شخص کہنے لگے کہ عہد وسطی کے ہندوستان کی تاریخ کی کلاس میں بیٹھنا ان کے لیے ایک اندوہناک تجربہ تھا۔اپنے دوستوں کی ملزم قرار دینے والی آنکھیں وہ ابھی تک محسوس کرتے ہیں جب ہندوستان سے مسلم حکمرانوں کے زریعے مال لے جانے کے واقعات معروضی تاریخ کے طور پر پڑھائے جاتے تھے۔ایک مسلم لڑکی جو صرف ۶ سال کی ہے جو دلی کے ایک ترقی یافتہ اسکول میں زیر تعلیم ہے اس نے اپنی ماں کی دانش مندی کا شکریہ ادا کیا کہ اپنے مسلم باپ کے نام کے لاحقے کو اس کے نام کا حصہ نہیں بننے دیا۔میری بیٹی کے اسکول کی پرنسپل نے اس کی اس شکایت پر یقین کرنے سے انکار کردیا کہ ایک ٹیچر نہایت زوروشور کے ساتھ مسلمانوں کو معاشرے سے اجنبی بنانے میں مصروف تھیں۔ہم لوگ سرسوتی ششو مندر تنظیم کے تحت اسکولوں کے سلسلے پر بات بھی نہیں کرتے ہیں جس نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے مکمل خلاف بنادیا ہے۔

پالیسی ساز اور اس کے اطلاق کرنے والے نہایت ڈھٹائی سے قومی تحفظ کے پردے میں اسلاموفوبیا کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔قریب ہی ایک دوست جو پولیس آفیسر اور سول سرونٹ کی ٹریننگ سے واپس آئے دل دہلانے والا تجربہ بیان کیا کہ انھوں نے وہاں مسلمانوں کو بے عزت کرنے والا بیان دیا اور اس بات پر زور دیا کہ انھیں اپنی اوقات میں رکھنے کی ضرورت ہے۔مختلف حکومتوں کے ذریعے مدرسوں سے اپنے قومی ہونے کا ثبوت مانگا جاتا ہے۔ہم لوگوں کو اس واقعے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی کہ تہذیب اور اقتصاد کے نام پر ایک بڑی تعداد کے طرز طعام کی بنیاد پر انھیں مجرم قرار دیا گیا۔ایودھیا مسئلہ میں سپریم کورٹ نے شری شری روی شنکر کو ثالث قرار دے کر انھیں مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کا مستحق بنادیا۔آپ مسلمانوں کے خلاف بول کر معزز ہو سکتے ہیں۔

مسلمان اسلاموفوبیا کی انتہائی شکل سے اس وقت دوچار ہوتے ہیں جب انھیں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ اتنے ماڈرن ہیں کہ آپ مسلمانوں جیسے نہیں دکھتے ہیں۔مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ آپ ایک مہذب سوسائٹی کے رکن کے طور پر تسلیم کیے جانے کے لیے مسلمان ہونے کی تمام شکلوں کو دھوڈالیے۔

الیکشن بالکل قریب ہے۔ہم ہندو ووٹ کو متحرک کرنے کے لیے مسلمانوں کو کھلے عام مطعون کیے جانے کا مشاہدہ کریں گے۔قریب ہی اسمبلی الیکشن کی مہم میں وزیراعظم اور اس کی پارٹی نے ایک ریاست میں مسلم وزیر اعلیٰ بنائے جانے کی سازش کی بات کہی۔ایک وزیر نے کھلے بندوں کچھ حلقوں کے مسلم اکثریت میں تبدیل ہوجانے کے اندیشہ کا اظہار کیا اور بدرالدین اجمل کے وزیر اعلیٰ بن جانے کے خطرناک نتائج پر گفتگو کی۔ہم نے مسلمانوں کو مطعون کرنے والوں کو اپنا رہنما بنالیا ہے اور مسلمانوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان رہنماؤں کو قبول کر کے اپنے معتدل ہونے اور مرکزی دھارا میں شامل ہونے کی شہادت پیش کریں۔ہم انھیں اپنے نمونے کے رہنما کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔اس اقدام کو معاشی ترقی کے تحفظ کے سودے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ پریم چند اور رام دھاری سنگھ دن کر جیسے تخلیق کاروں نے ہندوؤں سے بارہا یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو اپنے مساوی قبول کریں۔عرصہ ہوا وہ لوگ گذر گئے۔اسلاموفوبیا ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ہم ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں جو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں اور اس کے باوجود مہذب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔جب تک ہم اس فریب کو سمجھ نہیں جاتے اس وقت تک ان بیماریوں سے نجات حاصل کرنے کے اہل نہیں ہو سکتے ہیں۔

(بہ شکریہ دی انڈین ایکسپریس۔۲۱؍مارچ، نئی دہلی)

ماضی کے دریچے سے

۱۴۰ برس پرانی ایک کتاب

زاہدہ حنا

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ۱۹ویں صدی کے برصغیر میں تعلیم نسواں کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ مسلم اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی گنتی کی چند خواتین کو تھوڑا بہت پڑھنا سکھادیا جاتا تھا، عورتوں کا لکھنا سیکھنا گناہ کبیرہ نہیں تو گناہ صغیرہ کے زمرے میں ضرور آتا تھا۔ اس زمانے سے تعلق رکھنے والی کسی خاتون کا پڑھا لکھا ہونا ہی ایک عجوبہ تھا۔ ایسے میں کوئی عورت اگر کتاب لکھنے پر کمربستہ ہوجائے تو یہ اتنی ہی بڑی خبر تھی جتنی آج مریخ پر پانی کی موجودگی کی خبر۔

اس پس منظر سے واقف ہونے کے سبب جب ہندوستان کی راجیہ سبھا سے تعلق رکھنے والی مرحومہ عزیزہ امام صاحبہ کے توسط سے ۱۹۷۷ء میں ایک ناول ''اصلاح النساء'' میرے ہاتھ لگا تو میں حیران رہ گئی تھی۔ یہ ناول ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا اور ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا مقصد ومحور سماج کو عورتوں کی تعلیم کی اہمیت بتانا اور خود عورتوں کی اصلاح تھا۔

یہ ایک نادر و نایاب کتاب تھی جسے اردو کے ادبی حلقوں نے صرف نظرانداز ہی نہیں کیا بلکہ اس بارے میں چپ سادھے رکھی۔ چند دنوں پہلے اس ناول کا نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ ۱۴۰ برس بعد اس کتاب کی اشاعت ایک ایسا ادبی واقعہ ہے جس سے ''اردو نیوز'' کے قارئین کی آگاہی اس لئے ضروری ہے کہ وہ برصغیر سے سیکڑوں میل دور بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنے ماضی کی روشنی میں اپنے حال کو مرتب کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اسی نقطہ نظر سے آج کچھ باتیں ''اصلاح النساء'' اور اس کی مصنفہ رشیدۃ النساء کے بارے میں۔

پٹنہ میں پیدا ہونے والی رشیدۃ النساء کا تعلق ہندوستان کے ایک عالم وفاضل گھرانے سے تھا۔ وہ ایک شمس العلماء کی بیٹی اور دوسرے شمس العلماء نواب امداد امام اثر کی بہن تھیں۔ برصغیر کی جدوجہد آزادی کے دو اہم ترین افراد سر علی امام اور حسن امام ان کے بھتیجے تھے اور پاکستان کے وزیراعظم حسین شہید سہروردی اور سر عبدالرحیم ان کے اولاد۔

وہ جنگ آزادی سے ۴ برس پہلے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے مغل زوال کو اپنے کانوں سے سنا اور برطانوی عروج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ان کا خاندان برطانوی ہندوستان میں اقتدار سے جڑا ہوا رہا، جدید تہذیب کی روشنی ان کے خاندان کے زنان خانے میں تو نہیں آئی لیکن اس کا عکس زنان خانے کے اندھیرے میں پو پھٹنے کا ملگجا اجالا ضرور پھیلاتا رہا۔ انہوں نے کسی اسکول میں تعلیم نہیں پائی، اس کے باوجود انہیں زنانہ مدرسہ کھولنے کا شوق بے حد و بے حساب تھا۔ اس شوق کو انہوں نے ۲۰ویں صدی کی ابتداء میں پورا کیا۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے ایک زنانہ مدرسہ ''مدرسہ اسلامیہ'' قائم کیا جس کے معائنے کے لئے گورنر بنگال کی بیگم، لیڈی فریز آئیں، پٹنہ والوں کے لئے زنانہ مدرسے کا قیام اور لیڈی فریز کا اس کے معائنے کے لئے آنا ایک

بڑا واقعہ تھا۔ چنانچہ اس واقعے کا تذکرہ بہت دنوں تک شہر اور شہر والوں میں ہوتا رہا۔ یہ مدرسہ کئی برس تک چلتا رہا۔ اس مدرسے کو بعد میں بادشاہ نواب رضوی نے بی این آر اسکول کا نام دیا اور اپنی کچھ جائداد اس کے اخراجات کے لئے مختص کر دی۔ مہارانی بیتیا نے اس اسکول کیلئے عمارت دی، اس وجہ سے یہ اسکول ''بیتیا ہاوس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

رشیدۃ النساء کو اس بات کا صدمہ تھا کہ ان کے ارد گرد سانس لیتی ہوئی عورت تعلیم سے محروم اور اس کی لذتوں سے نا آشنا تھی۔ ۱۹ویں صدی کے ہندوستان میں Women Question دراصل عورتوں کی تعلیم اور جدید زندگی سے ان کی آشنائی سے جڑا ہوا تھا۔ یہ ڈپٹی نذیر احمد کی ''مرآۃ العروس'' تھی جس نے رشیدۃ النساء کو اس جیسا قصہ لکھنے پر اکسایا، مرآۃ العروس'' جیسی کئی کتابوں کے لکھے جانے کا سہرا ایک اعلیٰ برطانوی سرکاری افسر سرولیم میور کے سر ہے۔ سرولیم میور کو ہندوستانی عورتوں کی تعلیم سے گہری دلچسپی تھی۔ اس نے ۱۸۷۵ء میں جب مدرستہ العلوم، علی گڑھ کے اجلاس میں شرکت کی تو اردو میں تقریر کرتے ہوئے حاضرین جلسہ سے کہا تھا کہ مصری مسلمانوں کی طرح وہ بھی لڑکیوں کی جدید تعلیم کا انتظام کریں۔ تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لئے سرولیم کی ترغیب پر برٹش سرکار کی طرف سے ان کتابوں کو انعامات دینے کا اعلان کیا گیا جن میں مسلمان لڑکیوں کے لئے تعلیم کے فوائد بیان کئے گئے ہوں اور انہیں جدید علوم کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ''مرآۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں چھپی تو رشیدۃ النساء کی عمر ۱۶ برس تھی اور ابھی وہ نئی نویلی دلہن تھیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اردو کا یہ پہلا ناول کب ان کے ہاتھ لگا لیکن خود ان کا کہنا ہے کہ وہ اس سے بے حد متاثر ہوئیں۔ ان کے اپنے گھر اور خاندان میں ہر طرف علم وفن اور شعروادب کا چرچا تھا، گھر میں بھری ہوئی سینکڑوں کتابوں تک ان کی رسائی تھی لیکن جب اپنے ارد گرد آباد دوسرے گھرانوں اور ان کی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھتیں تو دل مسوس کر رہ جاتیں۔ یہ وہ گھر تھے جہاں کے زنان خانوں میں جہالت کے ساتھ ساتھ توہمات کا بھی ڈیرا تھا۔ ''مرآۃ العروس'' نے ان کے اندر کی لکھنے والی کو اکسایا اور خود ان کے کہنے کے مطابق انہوں نے ''اصلاح النساء'' لکھنے کا بیڑا اٹھایا تو اسے ۶ مہینے میں مکمل کر کے دم لیا۔ یہ ناول ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا اور ۱۸۹۴ء میں اس وقت شائع ہوا جب ان کا وہ بیٹا لندن سے قانون کی تعلیم حاصل کر کے آچکا تھا جس نے ۱۱ برس کی عمر میں ماں کو یہ ناول تحریر کرتے دیکھا تھا۔

کتابوں سے رشیدۃ النساء کو عشق تھا، اس عشق میں وہ کس انتہا کو پہنچ جاتی تھیں اس بارے میں ایک دلچسپ تحریر ان کے نواسے ڈاکٹر اقبال حسین کی ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین کا شمار بہار کے مشہور ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ساری عمر درس وتدریس سے وابستہ رہ کر گزاری، پٹنہ کالج کے پرنسپل اور بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہے۔ اپنی خودنوشت ''داستاں میری'' کے صفحے رشیدۃ النساء کے تذکرے سے بھرے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''خان بہادر خدا بخش خاں، بانی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور میرے نانا مرحوم میں دوستانہ تعلقات کے علاوہ سالے بہنوئی کا بھی منہ بولا رشتہ تھا۔ موصوف خان بہادر میری نانی مرحومہ کو بہن کہتے تھے اور ایک بہن کی حیثیت سے ان کا بہت ادب واحترام کرتے تھے۔ نانی مرحومہ بھی ان سے بھائی کی طرح سلوک سے پیش آتیں۔ نانی مرحومہ یہ بھی فرماتی تھیں کہ خدا بخش لائبریری میں جتنی نادر کتابیں ہیں اکثر وبیشتر چوری کر کے منگائی جاتی تھیں۔ خود خدا بخش خاں کا قول ہے کہ

''کتابوں کے جمع کرنے کا ہنر تعزیرات ہند کے قانون سے بالاتر ہوجاتا ہے اور اس کو للکارنا ہے۔'' اس قول کی روشنی میں انہوں نے کتابوں کی جمع آوری کے اپنے ذوق کی تکمیل کی۔ غرض جب بھی اُنہیں کسی نادر اور عمدہ کتاب کا سراغ ملتا تو پہلے اسے عاریتاً یا قیمتاً لینے کی کوشش کرتے، ناکامی کی صورت میں وہ کسی شخص سے اس کتاب کو چوری کرا کر منگا لیتے۔ جب ایسی کتابیں دستیاب ہوتیں تو اپنے گھر پشتہ والے مکان (جہاں اب اندرا انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیولوجی ہے) سے ان کتابوں کو ٹوکری میں رکھ کر اوپر سے کچھ کھانے پینے کی چیز رکھوا کر نانی مرحومہ کے گھر سبزی باغ نوکروں سے بھجوا دیتے اور تحفظ کے خیال سے خود پالکی پر آتے۔ نانی موصوفہ اپنے نوکر کو کہتیں کہ دیکھو جو تحفے کی ٹوکری خدا بخش کے یہاں سے آئی ہے پلنگ پر رکھ دو۔ نوکر رکھ دیتا۔ فرصت اور تنہائی کے وقت نانی ان کتابوں کو چھپا کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ خان بہادر خدا بخش کبھی کبھی تو ان کتابوں کو ۴ یا ۶ ماہ کے بعد جبکہ گرفت کے امکانات ختم ہوجاتے، منگوا لیتے یا خود آکر لے جاتے۔ نانی مرحومہ فرماتی تھیں کہ کبھی کبھی تو ایسی چوری کی ہوئی کتابوں کو ۳،۳ سال کے بعد لے جایا کرتے تھے۔''

رشیدۃ النساء کی شخصیت کا ذرا گہرائی میں جا کر جائزہ لیجئے تو دکھائی دیتا ہے کہ وہ متضاد رویوں اور حالتوں کے ساتھ زندگی کر رہی ہیں۔ وہ ایک ایسے شخص کی شریک حیات ہیں جو قانون داں، ادب دوست اور رئیس اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ فن موسیقی کا ماہر ہے۔ اس کے یہاں لوگ دور دور سے موسیقی کے رموز و نکات سمجھنے آتے ہیں۔ گھر میں ایک طرف علمائے صادق پور سے نیازمندی ہے، دوسری طرف روشن خیالی اور آزاد مشربی کا یہ عالم ہے کہ جس زمانے میں سگے باپ اور بھائیوں سے پردہ ہوتا تھا، اسی زمانے میں رشیدۃ النساء ایک نامحرم کو بھائی بناتی ہیں اور اپنے منہ بولے بھائی کی چرائی ہوئی نادر کتابیں کبھی مہینوں اور کبھی برسوں اپنے پاس رکھتی ہیں۔

پردہ نشین رشیدۃ النساء فرسودہ روایات سے بغاوت کرتی ہیں اور جس زمانے میں عورتوں کا لکھنا تو دور کی بات ہے، پڑھنا بھی ''جرم'' تھا، اس دور میں جیتے جاگتے انسانوں کی کہانی لکھنے کے لئے قلم اٹھاتی ہیں، اصلاح معاشرہ ان کا عزم ہے، تعلیم نسواں پر وہ اصرار کرتی ہیں، انگریزی سیکھنے اور سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتی ہیں۔

جہل کیسے کیسے عذاب لاتا ہے، اس کا نقشہ ''اصلاح النساء'' میں انہوں نے یوں کھینچا ہے کہ بسم اللہ اور اس کی ماں چونکہ پڑھی لکھی نہیں، اس لئے ذاتی خط پڑھوانے کے لئے کسی کی محتاج رہتی ہیں اور ۴ پیسے دے کر کسی طالب علم سے خط پڑھوا کر سنتی ہیں اور پھر پیسے دے کر ہی خط کا جواب لکھواتی ہیں۔ قانونی امور سے ناواقف ہیں، سرکاری کاغذات پڑھ نہیں سکتی ہیں، اپنی جائداد اور زمینوں کا انتظام و انصرام بھی ان کے بس کا نہیں چنانچہ ایک شخص کے نام ''جمیع امورات'' کا مختار نامہ لکھ دیتی ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مختار ان کی جائیداد پر قرض لیتا جاتا ہے، خود صاحب جائیداد ہوجاتا ہے اور ان ماں بیٹیوں کی لاکھوں کی جائیداد خاک ہوجاتی ہے۔

ہمارے لئے یہ فخر اور اعزاز کی بات ہے کہ ۱۹ویں صدی میں ہمارے یہاں وہ عورتیں پیدا ہو رہی تھیں جو اپنے سماج سے مکمل طور پر جڑی ہوئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی وہ جدید تعلیم اور سائنسی سوچ کو اختیار کرنے پر بھی اصرار کرتی تھیں۔ ماضی کے ان افراد کو یاد کرنا اور ان کے نام کو زندہ رکھنا ایسا ہی ہے جیسے چراغ سے چراغ جلائے جائیں تا کہ علم اور تہذیب کی روشنی دور دور تک پھیلتی رہے۔

(اُردو نیوز، جدہ۔ ۶ جولائی ۲۰۰۰ء)

☆☆☆

مراسلات

۱۹/۴/۲۵

محترم ڈاکٹر صاحب

اپریل کے ''فکر نو'' کا اداریہ، بے انتہا پسند کیا گیا ہے۔ آپ جتنی بے باکی سے سچی اور انصاف کی بات کہہ دیتے ہیں، اس طرح کی بات کہنے والوں کا اب فقدان ہے۔ اسی سے آپ کی بات لوگوں کے دلوں کو چھو جاتی ہے۔

امید ہے بخیریت ہوں گے۔

مخلص، افتخار عالم

●

مدیر محترم! اسلام مسنون

گذشتہ دو برسوں میں بار بار خیال آیا کہ ''فکر نو'' کے مشمولات کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اب جب کہ آپ بھی سوائے اداریہ کے دوسرے مشمولات اور ان کے مضمرات پر حسب معمول گہری توجہ مبذول نہیں کر پا رہے ہیں اور اسی باعث رسالہ میں بعض ایسی تحریریں شامل ہو جاتی ہیں جو فکر نو کی ساکھ یا سیاسی یا علمی و ادبی وقار کے لیے سوالیہ نشان قائم کرتی ہیں۔ ادھر جولائی ۲۰۱۹ء کے شمارے میں بعض خوشگوار تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں تو بے ساختہ ان کا خیر مقدم کرنے کو جی چاہا، جس کا ثبوت یہ چند سطریں ہیں۔

ادبی صحافت میں مصنف، مضمون نگار اور تخلیق کار کی اہمیت ہر زمانے میں تسلیم شدہ رہی ہے، مگر پیش کش کے نام سے جو مخلوق سامنے آنے لگی ہے اس کو کس خانے میں رکھا جائے۔ پھر یہ بھی ہوا ہے کہ کسی کتاب پر تبصرے کے نام سے چند سطروں کی تمہید کے بعد زیر تبصرہ کتاب کے اقتباس پر اقتباسات نقل کرتے چلے جانے سے مبصر کا مدعا کیا ہے؟ دراصل آپ نے پہلے کانفرنس گزٹ، میں اور ادھر فکر نو میں ادارتی نوٹ کے وسیلے سے جس ہوش مندی یا ادبی، سیاسی اور مذہبی معاملات پر جس انداز کی دانش ورانہ باتوں اور بصیرت افروزی کا اپنے قاری کو عادی بنا دیا ہے، اس کے سیاق و سباق میں رواروی میں لکھے گئے مضامین اور تبصروں کی پیش کش بہت گراں گزرتی ہے۔ اسی لیے یہ چند باتیں گوش گزار کرنی ناگزیر معلوم ہوئیں۔ ناچیز کو یقین ہے کہ ذرا سی توجہ سے متذکرہ غیر علمی اور غیر ادبی رویوں پر قدغن لگانا آسان ہوگا۔

نیاز مند

ابوالکلام قاسمی

●

مکرمی تسلیم!

مولانا آزاد کی ایک بھولی بسری تحریر ''فکر نو'' نے یاد دلا دی۔ لکھنے والے کا نام تو اجمل خاں ''چھپا'' ہے، جو مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری تھے، لیکن بہتوں کو شبہہ یہ ہوتا ہے کہ یہ عبارت خود مولانا ہی کے قلم سے نکلی ہے؛ یا اتنا تو ہوگا ہی کہ نظر ثانی مولانا نے ہی کی ہوگی، مولانا کے خاص الفاظ

علاقہ اور علائق کچھ تو چغلی کھاتے ہیں۔

مالک رام صاحب نے بڑا ظلم کیا کہ اس مقدمے کو جو غبار خاطر کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا، خارج کر کے اپنا مقدمہ نئے (ساہتیہ اکادمی) ایڈیشن میں شامل کر دیا۔ وہ اسے اجمل خاں کی تحریر ہی سمجھے اس غلط فہمی میں اردو دنیا کے واسطے مولانا کی قطعیت کے ساتھ ایک تحریر ہمیشہ کے لئے ضائع ہوگئی ['ہمیشہ کے لئے ضائع' لکھتے وقت اچھا نہیں لگا کیوں کہ اردو دنیا کے ایک بڑے حصہ میں وہ پرانا ایڈیشن اب بھی چھپتا رہتا ہے؛ اور بہت سی لائبریریوں میں قدیم ایڈیشن محفوظ ہے]۔

پروفیسر سید سعید احمد، بارہ بنکی

•

محترم جناب ریاض الرحمٰن شروانی صاحب
مدیر فکر نو، علی گڑھ
تسلیمات!

فکر نو کے جولائی 2019 کے شمارے میں صفحہ 48 پر جو مراسلہ میرے نام سے شائع ہوا ہے وہ مراسلہ میں نے نہیں لکھا ہے۔ کسی نے یہ مراسلہ لکھ کر میرے نام سے چھپوا دیا ہے۔ ایسی حرکت قابل مذمت ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرا یہ وضاحتی نوٹ اگلے شمارے میں چھاپ دیں۔

نیازمند
پروفیسر آصف نعیم

•

یہ جولائی کا مراسلہ جو میں نے برائے اشاعت بھیجا تھا اور میرے نام کے بجائے، کسی پروفیسر صاحب آصف کے نام سے چھپا، ان کا نام غلط چھپا، اس کی تصحیح کر دی جائے کہ پروفیسر صاحب کی جگہ مراسلہ نگار کا نام پتہ یہ ہے۔

عبدالرحمٰن، رامپور موہن پور، ارریہ، بہار

•

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے — عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے
طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم — یہ بھی سنو کہ نالۂ طائر بام اور ہے
آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں — کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا — اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیش جاوداں، ذوق طلب اگر نہ ہو — گردش آدمی ہے اور، گردش جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز — غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

(بانگ درا)

فکرِ نو کے دو سال

یہ فکر نو اگست ۲۰۱۷ء تا جولائی ۲۰۱۹ء کا دو سال کا مہینہ وار اشاریہ ھے ۔ مختصر عرصے کے لئے ہم کوئی بھی طور اختیار کر سکتے ھیں، تاھم اشاریہ سائنٹفک اس وقت ھوتا ھے جب موضوع وار ھو،موضوع وار بھتر طریقہ ھے، جو فی الحال اختیار نھیں کیا گیا، اس کی کمی کو ایک حد تک پورا کرنے کے لئے، اس اشاریہ کا ایک مصنف وار اشاریہ بھی بنا دیا گیا ھے۔ (ادارہ)

شائستہ خاں، تبصرہ: ر۔ش اکتوبر ۱۷ء

۳۴۔ مراسلہ: فکر نو کی ستائش، از طلعت آرا گل فشاں، علی گڑھ اکتوبر ۱۷ء

نومبر ۱۷ء

۳۵۔ اداریے: (۱) یوم تعلیم، (۲) تاج محل، نومبر ۱۷ء

۳۶۔ سرسید کے نیم آسودہ منصوبے افہام وتفہیم بین المذاہب کے احیاء و وسعت کی ضرورت اور اہمیت (پروفیسر مسعود الحسن) نومبر ۱۷ء

۳۷۔ غبار خاطر (مختار مسعود) نومبر ۱۷ء

۳۸۔ مشترکہ حق آسائش (ہرش مندر، مترجم: افتخار عالم خاں) نومبر ۱۷ء

۳۹۔ پروفیسر رضی الدین احمد کی نقدِ ابوالکلام (احتشام احمد ندوی) نومبر ۱۷ء

۴۰۔ نجمہ محمود کی ''زنجیر بے جستجو'' میں شامل ایم کاویانی کے ایک مضمون پر اظہار خیال) (پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی) نومبر ۱۷ء

۴۱۔ لیڈروں کا قصور ہے یا لیڈر بنانے والوں کا، (علی خاں، بشکریہ روزنامہ انقلاب) نومبر ۱۷ء

۴۲۔ ماضی کے دریچوں سے: ترجمان القرآن (خالد جیلانی) نومبر ۱۷ء

۴۳۔ محمڈن کالج کا اثر ملک کے دوسرے حصوں پر (حالی) نومبر ۱۷ء

۴۴۔ سرسید کا نظریۂ تعلیم، از افتخار عالم، تبصرہ: ر۔ش۔ (قسط-۲) نومبر ۱۷ء

۴۵۔ **مثنوی** کرب جاں، از غضنفر، مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی نومبر ۱۷ء

۴۶۔ مراسلہ: فکر نو کے اجراء پر مبارکباد، از خولہ شاہد نومبر ۱۷ء

دسمبر ۱۷ء

۴۷۔ اداریہ: ٹیپو سلطان دسمبر ۱۷ء

۴۸۔ رشید احمد صدیقی (مختار مسعود) دسمبر ۱۷ء

۴۹۔ رشید احمد صدیقی، از مختار مسعود پر ر۔ش۔ کا نوٹ، ص ۸، دسمبر ۱۷ء

۵۰۔ بھائی چارہ اور یک جہتی کی تشکیل (ہرش مندر/ افتخار عالم) دسمبر ۱۷ء

۵۱۔ مولانا آزاد پر سرسید کے اثر کے چند پہلو: رسالہ لسان الصدق کے پہلے شمارے کی روشنی میں (ڈاکٹر جمشید قمر) دسمبر ۱۷ء

۵۲۔ شبلیؒ کے دو مراسلے (ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی) دسمبر ۱۷ء

۵۳۔ احمد سورتی صاحب- کچھ یادیں (ریاض الرحمٰن شروانی) دسمبر ۱۷ء

۵۴۔ محبت: منقول از مقالات سرسید (سرسید احمد خاں) دسمبر ۱۷ء

۵۵۔ گوری لنکیش کا قتل (کمال احمد، سہ ماہی انگور، کلکتہ) دسمبر ۱۷ء

۵۶۔ غبار خاطر: ایک بازدید، از افشاں بانو، تبصرہ: ر۔ش۔ دسمبر ۱۷ء

۵۷۔ عابد سہیل- بند کتاب سے کھلی کتاب تک، مرتب: شکیل احمد، تبصرہ: ریاض الرحمٰن شروانی دسمبر ۱۷ء

۵۸۔ (۱) ذکر و فکر۔ فضل رب کریم، از وسیم احمد (۲) حدائق الریحان، از رئیس احمد نعمانی، تبصرہ از ادارہ، دسمبر ۱۷ء

جنوری ۲۰۱۸ء

۵۹۔ اداریہ: ہندستان کا مستقبل جنوری ۱۷ء

۶۰۔ خورشید الاسلام (از مختار مسعود) ماخوذ از حرف شوق ۱۷ء اور اس پر ریاض صاحب کا ایک نوٹ بھی ہے۔ جنوری ۱۷ء

۶۱۔ علی گڑھ میں پہلا دن-۱۹۵۱ء، از عابد اللہ غازی، ماخوذ از ''جہد مسلسل'' مضمون پر شیروانی صاحب کا ایک قطعی غیر متعلق نوٹ۔ جنوری ۱۷ء

۶۲۔ کیا تشدد جائز ہے (ہرش مندر/ افتخار عالم) جنوری ۱۷ء

۶۳۔ یہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک (عمارات علی گڑھ کے بارے میں) (از پروفیسر اصغر عباس) جنوری ۱۷ء

۶۴۔ عبدالسلام **کلکشن**۔ اور اس کے عطیہ گزار (شائستہ خان) جنوری ۱۷ء

۶۵۔ ماضی کے دریچوں سے: **چار بڑے** دانشور سرسید، شبلی، اقبال، عابد حسین، محمد مجیب (۲) **معمولی** دانشور حالی، محمد علی، نیاز فتح پوری، ذاکر صاحب، مجنوں، احتشام (۳) مولانا مودودی **دانشور نہیں وکیل** تھے، (از آل احمد سرور) جنوری ۱۷ء

۶۶۔ محفل قرآن (جلد ششم) از عتیق الرحمٰن سنبھلی، تبصرہ: ر۔ش۔ جنوری ۱۷ء

۶۷۔ سید سلیمان اشرف: احوال و آثار، از قمر الاسلام، تبصرہ: ر۔ش۔ جنوری ۱۷ء

۶۸۔ ''کاش'' از اے۔ ایس سجاد بخاری، تبصرہ: ر۔ش۔ جنوری ۱۷ء

۶۹۔ مراسلہ: قمر الہدیٰ فریدی، جنوری ۱۷ء

فروری ۲۰۱۸ء

۷۰۔ اداریہ: اخلاق سے افراز تک: دل ہمہ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم، فروری ۱۸ء

۷۱۔ ایک اچھی گورنمنٹ کا تصور (ہرش مندر/ افتخار عالم) فروری ۱۸ء

۷۲۔ آسٹریلیا میں اسلامی سماج کا ارتقا (احتشام احمد ندوی) فروری ۱۸ء

۷۳۔ اقبال کی ایک رباعی (ڈاکٹر شاہد قمر قاضی) دلوں کو مرکز مہر و وفا کر فروری ۱۸ء

۷۴۔ ماضی دریچے: ٹکڑیوں میں بٹے مسلمان (مناظر احسن گیلانی) فروری ۱۸ء

۷۵۔ عبدالسلام کلیکشن اور اس کے عطیہ گزار کے بارے میں چند معروضات (پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی) ڈاکٹر شائستہ خان کے مضمون پر ریاض صاحب کا کمینٹ جنرل یعقوب کو کرنل یونس سے بڑا بتایا ہے جو غلط ہے۔ دونوں بھائی ان (ریاض صاحب) کے ساتھ انگلش ہاؤس میں تھے، یوسف میاں کا بھی ذکر ہے جو بڑے بھائی تھے۔ سر عبدالصمد اپنے بچوں کے ملنے انگلش ہاؤس اکثر آتے تھے، یونس کی شادی شہزاد احمد خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی، دو بیٹے تھے، علیحدگی ہوگئی تھی، ۱۹۸۰ء کے وسط میں انتقال ہوا، ریاض صاحب نے میجر شیخ کا بھی ذکر کیا ہے، ان کی بیگم عائشہ شیخ دانیال پروگریسیو گروپ میں ۱۹۶۹/۱۹۷۰ میں شرکت کرتی تھیں، فروری ۱۸ء

۷۶۔ محفل قرآن (جلد ششم) از مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، تبصرہ: ریاض الرحمٰن شروانی (قسط-۲) فروری ۱۸ء

۷۷۔ ترکی کا سفر، از فیصل احمد ندوی بھٹکلی، تبصرہ: ر۔ش۔ فروری ۱۸ء

۷۸۔ منزل، از محمد اللہ خاں، تبصرہ: ریاض الرحمٰن شروانی فروری ۱۸ء

۷۹۔ مراسلہ: از رئیس احمد نعمانی، (ریاض صاحب پر سخت تنقید کی ہے، جسے ریاض صاحب نے مان لیا)، فروری ۱۸ء

<u>مارچ ۲۰۱۸ء</u>

۸۰۔ اداریے: (۱) طلاق ثلاثہ، (۲) ایک وضاحت (ریاض صاحب کی کسی عبارت سے معارف، اعظم گڑھ جنوری ۲۰۱۸ء: علی گڑھ اور سرسید پر دسمبر ۱۷ء کے اداریے سے معارف والوں کو ''دکھ'' ہوا، مدیر کو شبلی کے بارے میں اداریہ نمبر دو میں تفصیل سے لکھنا پڑا)، مارچ ۱۸ء

۸۱۔ دہشت گردی کے الزام کی حقیقت (ہرش مندر/افتخار عالم)، مارچ ۱۸ء

۸۲۔ ابن سینا کے قصیدہ عینیہ کا مطالعہ (احتشام احمد ندوی)، مارچ ۱۸ء

۸۳۔ پاکستان کے سفر کی علمی روداد-۱ (ابوسفیان اصلاحی)، مارچ ۱۸ء

۸۴۔ ماضی کے دریچوں سے: کتب خانہ اسکندریہ: کب جلا، کیوں جلا؟ دنیا کے قدیم ترین، عظیم کتب خانے کی کہانی سید سلیمان ندوی کی زبانی (پیشکش: شائستہ خان)، مارچ ۱۸ء

۸۵۔ شذرات سرسید، از اصغر عباس، تبصرہ: ر۔ش۔ مارچ ۱۸ء

۸۶۔ ادارۂ سرسید کے مشاہیر قرآنیات، از ابوسفیان اصلاحی، تبصرہ: ر۔ش۔ مارچ ۱۸ء

۸۷۔ سرسید بھارت کے انمول رتن، از اخلاص احمد شروانی، تبصرہ: ر۔ش۔ مارچ ۱۸ء

<u>اپریل ۲۰۱۸ء</u>

۸۸۔ اداریے: (۱) رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کا مکی اور مدنی دور اور آج کے ہندستان کے حالات میں اس کی تمثیل، (۲) دانش وری اور وکالت وسیاست (''ڈاکٹر عابد حسین میموریل لیکچر از آل احمد سرور'' کو مدیر نے جنوری ۲۰۱۸ء کے شمارے میں نقل کیا ہے، اس میں اردو کے چار بڑے دانشور کی بات آئی ہے، اس پر کچھ اضافہ۔ ریاض صاحب نے اپنے نوٹ میں سرسید کی سیاست اور سرسید کے عقائد سے اختلافی نوٹ بھی دیا ہے)۔ اپریل ۱۸ء

۸۹۔ مظلوم یا مجرم: ایک جائزہ (ہرش مندر/افتخار عالم خاں)، اپریل ۱۸ء

۹۰۔ عبدالباری ندوی کی عظمت کے چند پہلو (احتشام احمد ندوی)، اپریل ۱۸ء

۹۱۔ رومی کی مثنوی معنوی اور اقبال کا آفاقی پیغام، سماج کے عالمی منظر نامے میں قدر مشترک اور افادیت کا جائزہ (عبدالباری)، اپریل ۱۸ء

۹۲۔ پاکستان کے سفر کی علمی روداد-۲ (ابوسفیان اصلاحی)، اپریل ۱۸ء

۹۳۔ بابری مسجد کی سیاست میں سب سے بڑا نقصان مسلمانوں کا ہوا (شیلیش نارائن سنگھ)، اپریل ۱۸ء

۹۴۔ ماضی کے دریچوں سے: ہمارا مستقبل (نیاز فتح پوری)، اپریل ۱۸ء

۹۵۔ نقوش سیرت نبوی ﷺ، از ظفر الاسلام اصلاحی، تبصرہ: ر۔ش، اپریل ۱۸ء

۹۶۔ شعر اساس تنقید، از عطا عابدی، تبصرہ: ر۔ش۔ اپریل ۱۸ء

۹۷۔ مراسلہ: بیگم راشدہ خلیل کی وفات پر (از شاہد قمر قاضی)، اپریل ۱۸ء

<u>مئی ۲۰۱۸ء</u>

۹۸۔ اداریہ: ہندستان پر کس کی حکومت؟، مئی ۱۸ء

۹۹۔ تبدیلیٔ مذہب کا دنگل (۱) (ہرش مندر/افتخار عالم خاں)، مئی ۱۸ء

۱۰۰۔ پروفیسر رضی الدین احمد کی نقد ابوالکلام-۲، از احتشام احمد ندوی، مئی ۱۸ء

۱۰۱۔ رب کریم کی بندوں پر عنایات (پروفیسر وسیم احمد)، مئی ۱۸ء

۱۰۲۔ یہی علی گڑھ ہے (الحاج سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)، مئی ۱۸ء

۱۰۳۔ اسلامی معاشرے میں رواداری (ظفر دارک قاسمی)، مئی ۱۸ء

۱۰۴۔ ماضی کے دریچوں سے: عرب دنیا میں اجتہاد کی حالیہ کوششیں (از رہ

مثال) بحث کے لئے چند نقطے (نجات اللہ صدیقی)، مئی ۱۸ء

۱۰۵۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے، از حبیب الرحمن چغانی، تبصرہ: ر۔ش۔ مئی ۱۸ء

۱۰۶۔ کتاب الوفیات: (دوجلد، ۱۰۵۰ صفحات)، از ابوذر متین (**البعث الاسلامی** کے وفیات: ۳۵۴ شخصیات)، تبصرہ: ر۔ش۔ مئی ۱۸ء

۱۰۷۔ سخن غنچہ، از غضنفر، تبصرہ: ر۔ش۔ مئی ۱۸ء

۱۰۸۔ مسائل ومباحث: ریاض صاحب کی نئی کتاب کا تذکرہ، مئی ۱۸ء

جون ۲۰۱۸ء

۱۰۹۔ اداریہ: مسلم یونیورسٹی کے ۲ مئی کے سانحے کا منظر اور پس منظر: (مسٹر جناح کی تصویر کا ہنگامہ، جون ۱۸ء

۱۱۰۔ تبدیلیٔ مذہب کا دنگل (قسط-۲) (ہرش مندر/ افتخار عالم)، جون ۱۸ء

۱۱۱۔ پروفیسر رضی الدین احمد (قسط-۲) (احتشام احمد ندوی)، جون ۱۸ء

۱۱۲۔ مقصد کی بلندی نے سرسید کی راہیں ہموار کیں (ظفر الاسلام اصلاحی)، جون ۱۸ء

۱۱۳۔ صبر اور اس کے مختلف مظاہر (پروفیسر وسیم احمد)، جون ۱۸ء

۱۱۴۔ خلیل الرحمن اعظمی کے ادبی ذوق کی نمود اور نمو (اخلاق احمد)، جون ۱۸ء

۱۱۵۔ اسلامی معاشرے میں رواداری کا تصور-۲ (ظفر دارک قاسمی)، جون ۱۸ء

۱۱۶۔ ماضی کے دریچوں سے: اجتہاد عصر حاضر میں: چند معروضات (محمد نجات اللہ صدیقی)، جون ۱۸ء

۱۱۷۔ غیر مرئی انسان (The invisible man) از ایچ۔ جی۔ ویلس، مترجم: عابد سہیل، تبصرہ: ب ع ر، جون ۱۸ء

۱۱۸۔ پابہ رکاب: سفرنامے، از ابوسفیان اصلاحی، تبصرہ: آصف نعیم، جون ۱۸ء

۱۱۹۔ بررسی ادبیات امروز ایران-یا- جدید فارسی ادب کا مطالعہ، از محمد استعلامی، مترجم: رئیس احمد نعمانی، تبصرہ: آصف نعیم، جون ۱۸ء

۱۲۰۔ افکار حسن، از حسن عبداللہ، مرتب: ڈاکٹر نوشابہ صدیقی، تبصرہ: ڈاکٹر شائستہ خان، جون ۱۸ء

جولائی ۲۰۱۸ء

۱۲۱۔ اداریے: (۱) انصاف (کرناٹک کی وزارت سازی میں گورنر کا رول)، (۲) کچھ اپنے بارے میں: خاکسار مدیر فکر نو علی گڑھ آج کل علیل ہے (علالت کی تفصیل)، تبصرے یا ہم بالکل نہ چھاپیں یا کسی اور سے لکھوا کر چھاپ دیں، دوسری صورت ہمیں پسند۔ جولائی ۱۸ء

۱۲۲۔ تبدیلیٔ مذہب کا دنگل-۳ (ہرش مندر/ افتخار عالم) جولائی ۱۸ء

۱۲۳۔ پروفیسر رضی الدین احمد-۳ (سید احتشام احمد ندوی) جولائی ۱۸ء

۱۲۴۔ سرسید، مولانا آزاد اور علی گڑھ (اصغر عباس) جولائی ۱۸ء

۱۲۵۔ مطالعہ میر، اور فاروقی کی بیدل شناسی (آصف نعیم) جولائی ۱۸ء

۱۲۶۔ خلیل الرحمن اعظمی کے ادبی ذوق کی نمود-۲ (اخلاق احمد) جولائی ۱۸ء

۱۲۷۔ ماضی دریچے: کیا ہندو اہل کتاب ہیں (مہر محمد شہاب مالیر کوٹلوی) جولائی ۱۸ء

۱۲۸۔ مضامین ڈار، از ابراہیم ڈار، مرتب: افضل حق قرشی، تبصرہ: ب ع ر، جولائی ۱۸ء

۱۲۹۔ نوادرات شبلی، مرتب: الیاس الاعظمی، تبصرہ: آصف نعیم، جولائی ۱۸ء

۱۳۰۔ محبت نامے، مرتب: الیاس الاعظمی، تبصرہ: شائستہ خان، جولائی ۱۸ء

۱۳۱۔ مراسلہ: رام راج کی وضاحت (آصف نعیم) (جولائی ۲۰۱۸ء)

اگست ۲۰۱۸ء

۱۳۲۔ اداریہ: تشدد میں اضافہ (اگست ۲۰۱۸ء)

۱۳۳۔ تبدیلیٔ مذہب کا دنگل-۴ (ہرش مندر/ افتخار عالم) اگست ۱۸ء

۱۳۴۔ پروفیسر رضی الدین احمد قسط-۴، از احتشام احمد ندوی، اگست ۱۸ء

۱۳۵۔ سرسید کے پنجاب کے پانچ سفر (اصغر عباس) اگست ۱۸ء

۱۳۶۔ بڑے دانشور، سرور دانشور کی محفل میں (عابد رضا بیدار، اگست ۱۸ء

۱۳۷۔ خلیل الرحمن اعظمی کے ادبی ذوق کی نمود-۳ (اخلاق احمد) اگست ۱۸ء

۱۳۸۔ اسلامی معاشرہ میں رواداری کا تصور-۳، از ظفر دارک قاسمی، اگست ۱۸ء

۱۳۹۔ ماضی دریچے: ہماری قدامت پرستیاں، از نیاز فتح پوری، اگست ۱۸ء

۱۴۰۔ علی گڑھ اور دینی تعلیم، از خلیق احمد نظامی، تبصرہ: ب ع ر، اگست ۱۸ء

۱۴۱۔ خیام شناسی، از اخلاق احمد آہن، تبصرہ: آصف نعیم صدیقی، اگست ۱۸ء

۱۴۲۔ حیات طیب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، از حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، تبصرہ: ڈاکٹر شائستہ خان اگست ۱۸ء

۱۴۳۔ مراسلہ: ضروری وضاحت (الیاس اعظمی کی نوادرات پر میرے تبصرے میں اصل عبارت پر کاتب کی غفلت کا شکار ہوگئی، اس لیے اب تلافی) (از آصف نعیم) اگست ۲۰۱۸ء)

۱۴۴۔ مراسلہ: رام راج: آصف نعیم کے مقالے پر (زاہد علی خاں) اگست ۱۸ء

ستمبر ۲۰۱۸ء

۱۴۵۔اداریہ: علی گڑھ کی اعلیٰ وادبی روایات (ستمبر ۲۰۱۸ء)

۱۴۶۔۱۹۸۴ء کی بھولی بسری یادیں-۱ (ہرش مندر/ افتخار عالم) (ستمبر ۱۸ء

۱۴۷۔علی گڑھ کا دھڑکتا دل لٹن لائبریری (اصغر عباس) ستمبر ۱۸ء

۱۴۸۔مکتبہ جامعہ والے شاہد علی خاں (عابد رضا بیدار) ستمبر ۱۸ء

۱۴۹۔علی گڑھ تحریک کے بنیاد گزار، از ظفر الاسلام اصلاحی (سید عبدالباقی کے مضامین کا مجموعہ مرتبہ سید محمد احمد وخواجہ شاہد) ستمبر ۱۸ء

۱۵۰۔عملی زندگی اور سلسلۂ روز وشب (وسیم احمد) (ستمبر ۱۸ء

۱۵۱۔انڈیا ونس فریڈم: مولانا آزاد کی تصنیف یا ہمایوں کبیر کا انٹرویو (شائستہ خان) (ستمبر ۲۰۱۸ء)

۱۵۲۔اسلام کا ایک اور نام (مجتبیٰ خاں، دبئی) (ستمبر ۲۰۱۸ء)

۱۵۳۔ماضی دریچے: نظریۂ اسلام میری نظر میں (نیاز فتحپوری) ستمبر ۱۸ء

۱۵۴۔عابد اللہ غازی اہل فکر وفن کی نظر میں: عالمی شخصیت اور کارہائے نمایاں، مرتبہ: شہناز کنول غازی، تبصرہ: ب ع ر (ستمبر ۱۸ء

۱۵۵۔حیرت سرائے کی کہانیاں-۲، از اطہر صدیقی، تبصرہ: ڈاکٹر شائستہ خان، ستمبر ۱۸ء

اکتوبر ۲۰۱۸ء

۱۵۶۔اداریہ: مذہب یا ثقافت (اکتوبر ۲۰۱۸ء)

۱۵۷۔۱۹۸۴ء کی بھولی بسری یادیں-۲ (ہرش مندر/ افتخار عالم) (اکتوبر ۱۸ء

۱۵۸۔سرسید، ذکاء اللہ اور علی گڑھ-۲ (اصغر عباس) اکتوبر ۱۸ء

۱۵۹۔ علی گڑھ تحریک کے بنیاد گزار-۲، از ظفر الاسلام اصلاحی (سید عبدالباقی کے مضامین کا مجموعہ مرتبہ سید محمد احمد وخواجہ شاہد اکتوبر ۱۸ء

۱۶۰۔اسلام میں اصلاحی تحریک کی معنویت (راشد شاز) اکتوبر ۱۸ء

۱۶۱۔نصاب تعلیم کو عصری تقاضوں سے مربوط کرنا ضروری (ظفر دارک قاسمی) (اکتوبر ۱۸ء

۱۶۲۔اکبر علی خاں عرشی زادہ (عتیق جیلانی سالک) (اکتوبر ۲۰۱۸ء)

۱۶۳۔ ماضی دریچے: ایک سچی کہانی (از یونس قاضی، پیشکش: شائستہ خان) اکتوبر ۱۸ء

۱۶۴۔کاشف الحقائق مصنفہ سید امداد امام اثر، مقدمہ وتلخیص: خالد حیدر (خالد سیف اللہ) تبصرہ: ب ع ر، اکتوبر ۱۸ء

۱۶۵۔سرمایہ غزل، از صدیق مجیبی، مرتب وناشر: سرور ساجد (غلام سرور خاں) تبصرہ: شائستہ خان، اکتوبر ۱۸ء

نومبر ۲۰۱۸ء

۱۶۶۔اداریہ: جمہوریت یا وراثت،؟، نومبر ۱۸ء

۱۶۷۔عقیدہ اور بخشش-۱ (ہرش مندر/ افتخار عالم خاں) نومبر ۱۸ء

۱۶۸۔اہل کتاب-۱ (ڈاکٹر عابد رضا بیدار)، نومبر ۱۸ء

۱۶۹۔مسلم فرقے، مسالک اور مفاہمت (مفتی زاہد علی خاں) نومبر ۱۸ء

۱۷۰۔کچھ دیر کملیشور کے ساتھ: 'کتنے پاکستان' کی روشنی میں (پیشکش: ڈاکٹر شائستہ خان) نومبر ۱۸ء

۱۷۱۔ماضی دریچے: فقہ اسلامی کی روح خوابیدہ: علامہ اقبال کا زاویۂ نگاہ (مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی)، نومبر ۱۸ء

۱۷۲۔حیات طیب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، از محمد یعقوب نانوتوی، مرتب: نور الحسن راشد کاندھلوی، تبصرہ: ڈاکٹر شائستہ خان (یہ تبصرہ فکر نو کے اگست ۱۸ء میں عجلت میں ادھورا ہی چھپ گیا، اس لئے ......اب تمام وکمال)۔نومبر ۱۸ء

۱۷۳۔یادگار نامہ، مولانا عبدالسلام خاں رامپوری کی یاد میں۔ (۱۹۱۷-۲۰۰۹ء) از سید حسن عباس، تبصرہ: شائستہ خان، نومبر ۱۸ء

دسمبر ۲۰۱۸ء

۱۷۴۔اداریہ: انصاف زندہ ہے (دسمبر ۲۰۱۸ء)

۱۷۵۔عقیدہ اور بخشش-۲ (ہرش مندر/ افتخار عالم خاں)، دسمبر ۱۸ء

۱۷۶۔اہل کتاب-۲: مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی کے قلم سے (عابد رضا بیدار) (یہ جولائی ۱۸ء میں "ماضی دریچے" میں بھی مجملاً چھپا تھا)، دسمبر ۱۸ء

۱۷۷۔تاج الدین سبکی (احتشام احمد ندوی) دسمبر ۱۸ء

۱۷۸۔خلیل الرحمٰن اعظمی: ذہنی سفر کی روداد، ترقی پسندی سے شہر ذات تک: ایک بھولی بسری عاق شدہ نظم **آئینہ خانے میں**: بازیافت (شائستہ خان) (دسمبر ۲۰۱۸ء)

۱۷۹۔ماضی دریچے: ہندستان میں اسلام، از آصف علی اصغر فیضی، دسمبر ۱۸ء

۱۸۰۔افسانیات، از عابد سہیل، مرتبہ: نصرت سہیل، تبصرہ: ب ع ر دسمبر ۱۸ء

۱۸۱۔ آزادی کے بعد اردو میں عربی ادب کے جائزے، از محمد شارق،
تبصرہ: شائستہ خان، دسمبر ۱۸ء

جنوری، ۲۰۱۹ء

۱۸۲۔ اداریہ: کرتارپور، کوری ڈور، جنوری ۱۹ء
۱۸۳۔ رحم اور انصاف کی تشریح (ہرش مندر/ افتخار عالم خاں) جنوری ۱۹ء
۱۸۴۔ تحفۃ المجاہدین کا ایک مطالعہ (احتشام احمد ندوی) (جنوری ۱۹ء
۱۸۵۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک قیمتی ذخیرۂ مخطوطات (جواہر میوزیم) اور اس کے بانی، اٹاوہ کے خان بہادر بشیر الدین کے بارے میں، (ڈاکٹر شائستہ خان) جنوری ۱۹ء
۱۸۶۔ اے کاش ترے دل میں اتر جائے مری بات (الحاج اخلاص احمد شروانی) جنوری ۱۹ء
۱۸۷۔ ماضی دریچے: اہل کتاب-۳ (مولانا مناظر احسن گیلانی) جنوری ۱۹ء
۱۸۸۔ جہدِ مسلسل- علی گڑھ سے علی گڑھ تک (جولائی 1951ء تا مئی ۱۹۵۹ء)، مؤلف: ڈاکٹر عابد اللہ غازی، تبصرہ: ب ع ر، جنوری ۱۹ء
۱۸۹۔ شعرائے اردو کے تذکرے، خصوصیات و امتیازات، از عبد الرازق،
تبصرہ: ب ع ر، جنوری ۱۹ء
۱۹۰۔ مراسلہ: سرسید کی تحریروں میں **مرحوم** ہندو دوستوں کا ذکرِ خیر (از ڈاکٹر اصغر عباس)، جنوری ۱۹ء

فروری، ۲۰۱۹ء

۱۹۱۔ اداریہ: حالیہ دور انتشار، فروری ۱۹ء
۱۹۲۔ ہماری ہمدردی کا محدود دائرہ (ہرش مندر/ افتخار عالم خاں) فروری ۱۹ء
۱۹۳۔ اہل کتاب-۴: میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے! ''سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا'' علامہ اقبال (از عابد رضا بیدار) فروری ۱۹ء
۱۹۴۔ پروفیسر مختار الدین احمد کی تصانیف (احتشام احمد ندوی) فروری ۱۹ء
۱۹۵۔ مالک رام کی دو نادر تحریریں: کوٹلیہ کا ارتھ شاستر -اور- منوسمرتی (پیشکش: شائستہ خان) فروری ۱۹ء
۱۹۶۔ اسلام اور پلورلزم (pluralism): مولانا ابو الکلام آزاد کے نظریات کا جائزہ (ظفر دارک قاسمی) فروری ۱۹ء
۱۹۷۔ ماضی دریچے: اسلام اور مسلمان (مولانا مناظر احسن گیلانی) فروری ۱۹ء
۱۹۸۔ مسائل و مباحث، از ریاض الرحمٰن شروانی، تبصرہ: محمد سجاد، فروری ۱۹ء
۱۹۹۔ مطالعۂ شعر و ادب، از مقصود احمد، تبصرہ: شائستہ خان، فروری ۱۹ء
۲۰۰۔ پروفیسر محمد شفیق کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، از ناظمہ جبیں،
تبصرہ: ب ع ر: اضافہ ڈاکٹر شائستہ خان، فروری ۱۹ء
۲۰۱۔ مراسلہ: صدیق مجیبی کے متن کی تصحیح (از سرور ساجد) سرمایہ غزل از ڈاکٹر سرور ساجد پر فکر نو، اکتوبر ۱۸ء میں تبصرہ کے بارے میں، فروری ۱۹ء

مارچ، ۲۰۱۹ء

۲۰۲۔ اداریہ: مسلمانوں کی چند کمزوریاں، مارچ ۱۹ء
۲۰۳۔ دیوار کے دوسری طرف (ہرش مندر/ افتخار عالم)، مارچ ۱۹ء
۲۰۴۔ پرتگالیوں سے جنگوں میں تین تاریخی واقعات: تحفۃ المجاہدین کی روشنی میں (احتشام احمد ندوی)، مارچ ۱۹ء
۲۰۵۔ غالب اور اقبال کے بعد، اردو کا ایک بڑا مفکر: رشید احمد صدیقی (شائستہ خان)، مارچ ۱۹ء
۲۰۶۔ ماضی دریچے: مالک رام کی دو نادر تحریریں ''منوسمرتی'' (پیشکش: شائستہ خان)، مارچ ۱۹ء
۲۰۷۔ مکاتیب قاضی عبد الودود (دو مجلد)، تلاش و ترتیب: محضر رضا، تبصرہ: ب ع ر (مولانا آزاد پر کچھ مزید)، مارچ ۱۹ء
۲۰۸۔ چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو (خاکے)، از اطہر پرویز، مرتب: سیما پرویز،
تبصرہ: ب ع ر (تبصرہ کے ذیل میں ریاض الرحمٰن صاحب کی کچھ یادداشتیں)، مارچ ۱۹ء

اپریل ۲۰۱۹ء

۲۰۹۔ اداریہ: جنگ کے خلاف، امن کے حق میں، اپریل ۱۹ء
۲۱۰۔ نئے ہندستان کا ''اکلاویا'' (ہرش مندر/ افتخار عالم)، اپریل ۱۹ء
۲۱۱۔ ادب بسر کرنا/ ادب میں بسر کرنا/ ادب کے ساتھ بسر کرنا (طارق چھتاری)، اپریل ۱۹ء
۲۱۲۔ خاندان علی راجا (احتشام احمد ندوی)، اپریل ۱۹ء
۲۱۳۔ شاید کہ مرے دل میں اتر آئی تری بات (پروفیسر محمد اقبال)، اپریل ۱۹ء
۲۱۴۔ کتابوں کی باتیں (از پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی) (نوٹ: جمشید مارکر کی آٹو بایوگرافی پر)، اپریل ۱۹ء

۲۱۵۔ مہر کا مائکروفنانس (محمد معراج احمد خاں انجینئر)، اپریل ۱۹ء
۲۱۶۔ ماضی دریچے: مسلم سماج کے لیے اسلام کا جدید مفہوم تلاش کرنے کی ضرورت (ضیاء الدین سردار/ ریاض الرحمٰن شروانی)، اپریل ۱۹ء
۲۱۷۔ مسلم یونیورسٹی کی کہانی، فرزندانِ علی گڑھ کی زبانی، مرتب: ڈاکٹر راحت ابرار، تبصرہ: ڈاکٹر شائستہ خان، اپریل ۱۹ء
۲۱۸۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا قیام اور اس کے اولین نقوش، مصنف: ظفر الاسلام اصلاحی، تبصرہ: شائستہ خان، اپریل ۱۹ء

مئی ۲۰۱۹ء

۲۱۹۔ اداریہ: (۱) پھر کس سے انصاف چاہیں؟ مئی ۱۹ء
۲۲۰۔ اداریہ: (۲) دو جرم اور دو ردِ عمل، مئی ۱۹ء
۲۲۱۔ اسلام اور مسلمان ہندستان میں (غیر مطبوعہ) (اے ایم خسرو)، مئی ۱۹ء
۲۲۲۔ نئے ہندستان کا 'اکلاویا'-۲ (ہرش مندر/ افتخار عالم)، مئی ۱۹ء
۲۲۳۔ مکان کا فلسفیانہ مطالعہ (احتشام احمد ندوی)، مئی ۱۹ء
۲۲۴۔ مدرسۃ العلوم کے لئے مقام کے انتخاب کے بارے میں سرسید کی رائے طلبی اور مولانا حالی کا اظہارِ خیال (ظفر الاسلام اصلاحی)، مئی ۱۹ء
۲۲۵۔ عابد اللہ غازی کی کتاب: جہدِ مسلسل، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، ۱۹۵۱-۱۹۵۹ء: کچھ عابد اللہ غازی کچھ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی کے قلم سے، مئی ۱۹ء
۲۲۶۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود (رضی احمد چشتی)، مئی ۱۹ء
۲۲۷۔ ماضی دریچے: مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی (از احمد سعید ملیح آبادی)، مئی ۱۹ء
۲۲۸۔ مآثر رحیمی (خان خاناں بیرم اور عبدالرحیم کی سوانح)، از عبدالباقی نہاوندی، مترجم: سید منصور علی سہروردی، نظر ثانی: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، حواشی و ضمیمہ جات: ڈاکٹر حسن بیگ، تبصرہ: ب ع ر، مئی ۱۹ء
۲۲۹۔ جہات سرسید، از ڈاکٹر شمس بدایونی، تبصرہ: شائستہ خان، مئی ۱۹ء

جون ۲۰۱۹ء

۲۳۰۔ اداریہ (۱) احکام الٰہی کی خلاف ورزی، جون ۱۹ء
۲۳۱۔ اداریہ (۲): حق و انصاف سے انحراف، جون ۱۹ء
۲۳۲۔ نئے ہندستان کے 'اکلاویا'-۳ (ہرش مندر/ افتخار عالم خاں)، جون ۱۹ء
۲۳۳۔ بنیادی دائرہ کا تعین (عابد رضا بیدار)، جون ۱۹ء
۲۳۴۔ مجالس حسنی (احتشام احمد ندوی) جون ۱۹ء
۲۳۵۔ ادب بسر کرنا/ ادب میں بسر کرنا (محمد علی جوہر)، جون ۱۹ء
۲۳۶۔ دانشوری کی نئی لہریں ((انتخاب: شائستہ خان)، جون ۱۹ء
۲۳۷۔ چودھری خوشی محمد ناظر (ڈاکٹر انور احمد)، جون ۱۹ء
۲۳۸۔ بچوں کے لئے سیرت نگاری ایک جائزہ (ظفر دارک قاسمی) جون ۱۹ء
۲۳۹۔ ماضی دریچے: (۱) ظفر علی خاں (زخ ش)، جون ۱۹ء
۲۴۰۔ (۲) اردو کی ایک گمنام شاعرہ (ممتاز علی خاں سہاوری)، جون ۱۹ء
۲۴۱۔ مشاہیر کے خطوط محمد عتیق الرحمٰن کے نام، تبصرہ: ب ع ر، جون ۱۹ء
۲۴۲۔ قرآن کریم اور اللہ کے بندوں ج کو نفع رسانی، از ظفر الاسلام اصلاحی، تبصرہ: سراج کریم سلفی، جون ۱۹ء
۲۴۳۔ مراسلہ: جمشید مارکر، از اصغر عباس، جون ۱۹ء
۲۴۴۔ مراسلہ: (مہر کے سلسلہ میں) از انجینئر معراج احمد خاں، جون ۱۹ء

جولائی ۲۰۱۹ء

۲۴۵۔ **اداریہ**: الیکشن کے بعد: اقلیتوں کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں (ریاض الرحمٰن شروانی) جولائی ۱۹ء
۲۴۶۔ اہم ادبی منشور- غیر مطبوعہ (پروفیسر آل احمد سرور) جولائی ۱۹ء
۲۴۷۔ نئے ہندستان کے ''اکلاویہ'' (تحریر: ہرش مندر/ افتخار عالم) جولائی ۱۹ء
۲۴۸۔ رشید احمد صدیقی کا مضمون ''سید علی گڑھ میں'' (اصغر عباس) جولائی ۱۹ء
۲۴۹۔ عربی ادب میں کتاب الاغانی کی عظمت (احتشام احمد ندوی) جولائی ۱۹ء
۲۵۰۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ (بدرالدین الحافظ) جولائی ۱۹ء
۲۵۱۔ حسن اخلاق (ظفر الاسلام اصلاحی) (جولائی ۱۹ء
۲۵۲۔ غبار خاطر کا مقدمہ: کیا یہ مولانا آزاد کی تحریر ہے؟ (پیشکش: ڈاکٹر شائستہ خان) جولائی ۱۹ء
۲۵۳۔ ''سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب'' (تبصرہ: ش) جولائی ۱۹ء

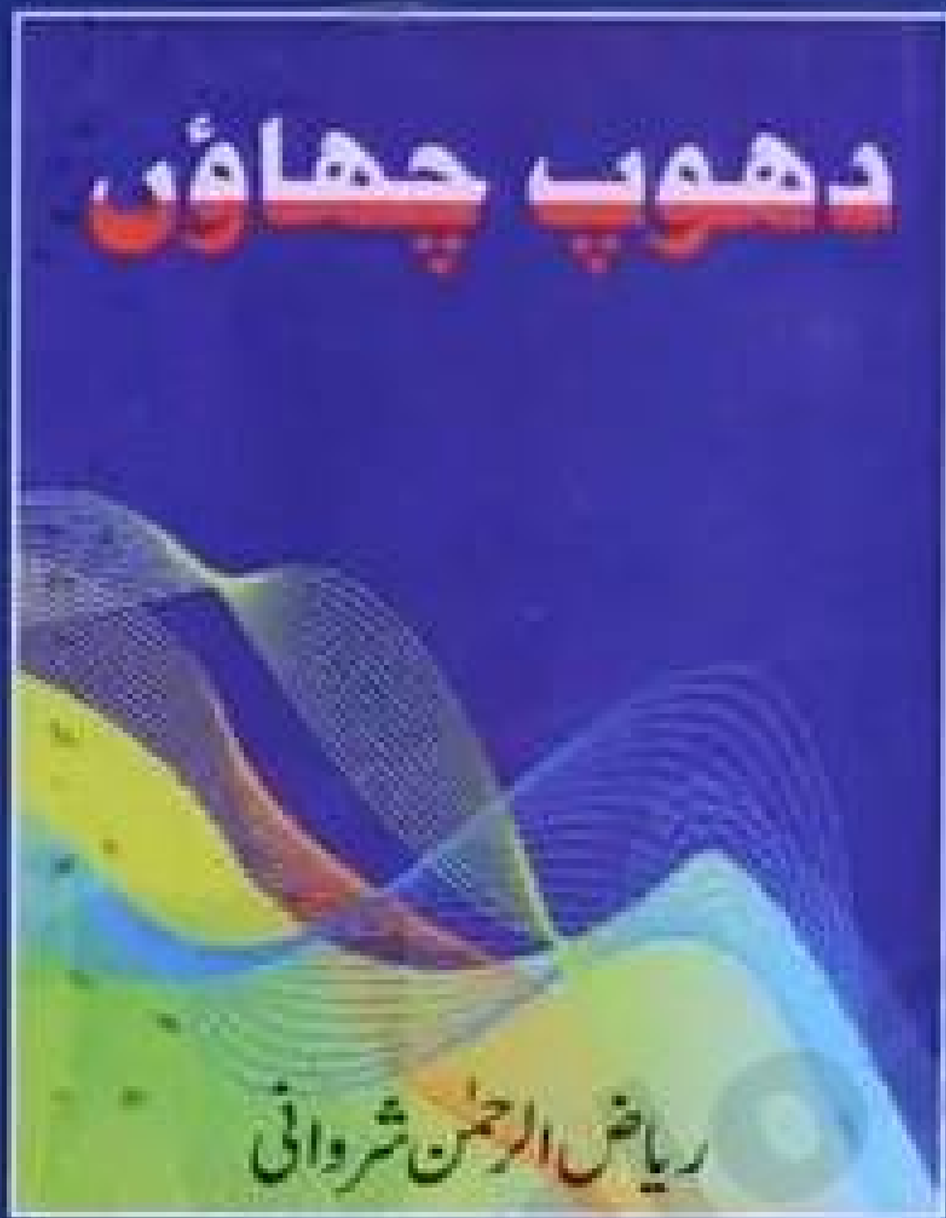
Monthly **FIKR-E-NAU** Aligarh

August 2019

تصانیف پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی



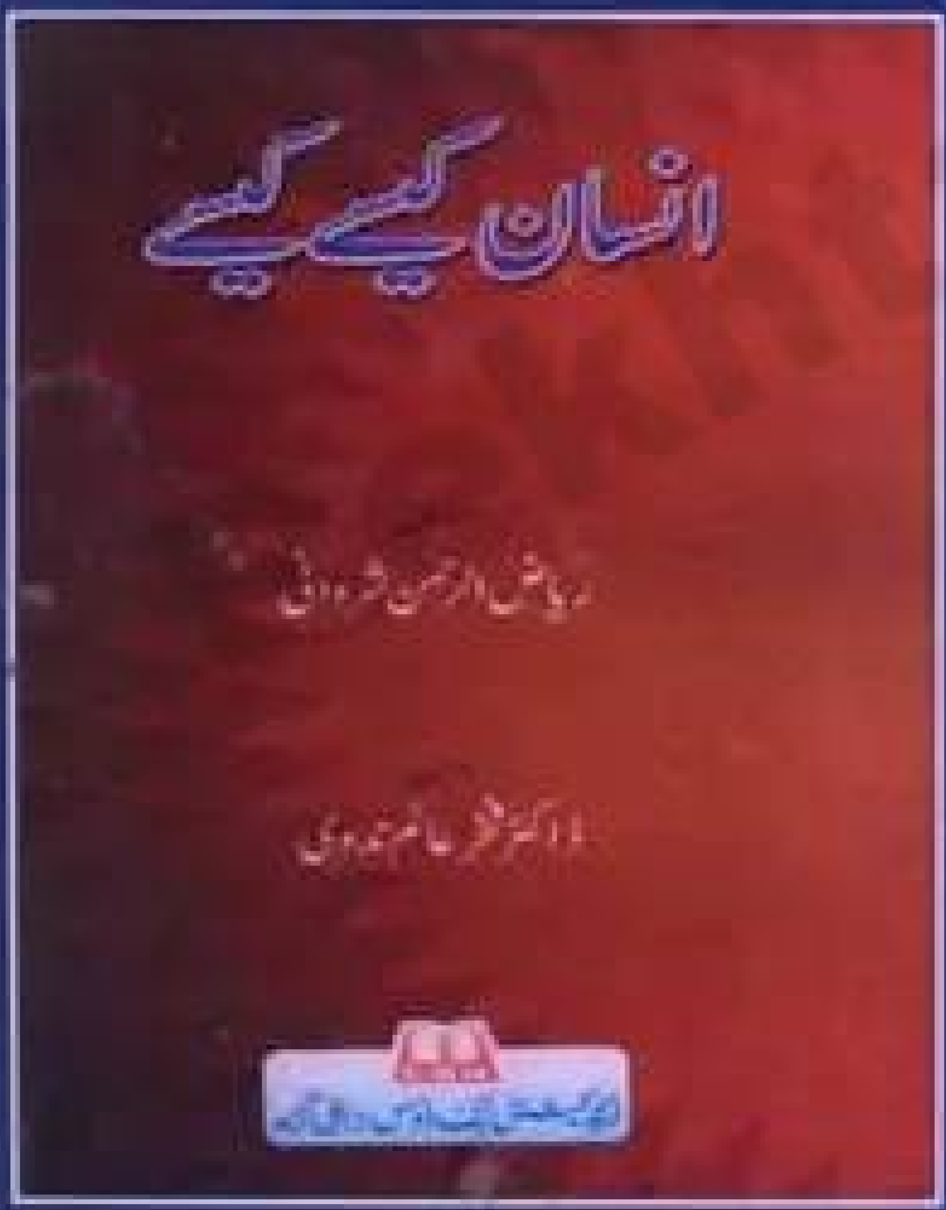
₹ 500/-



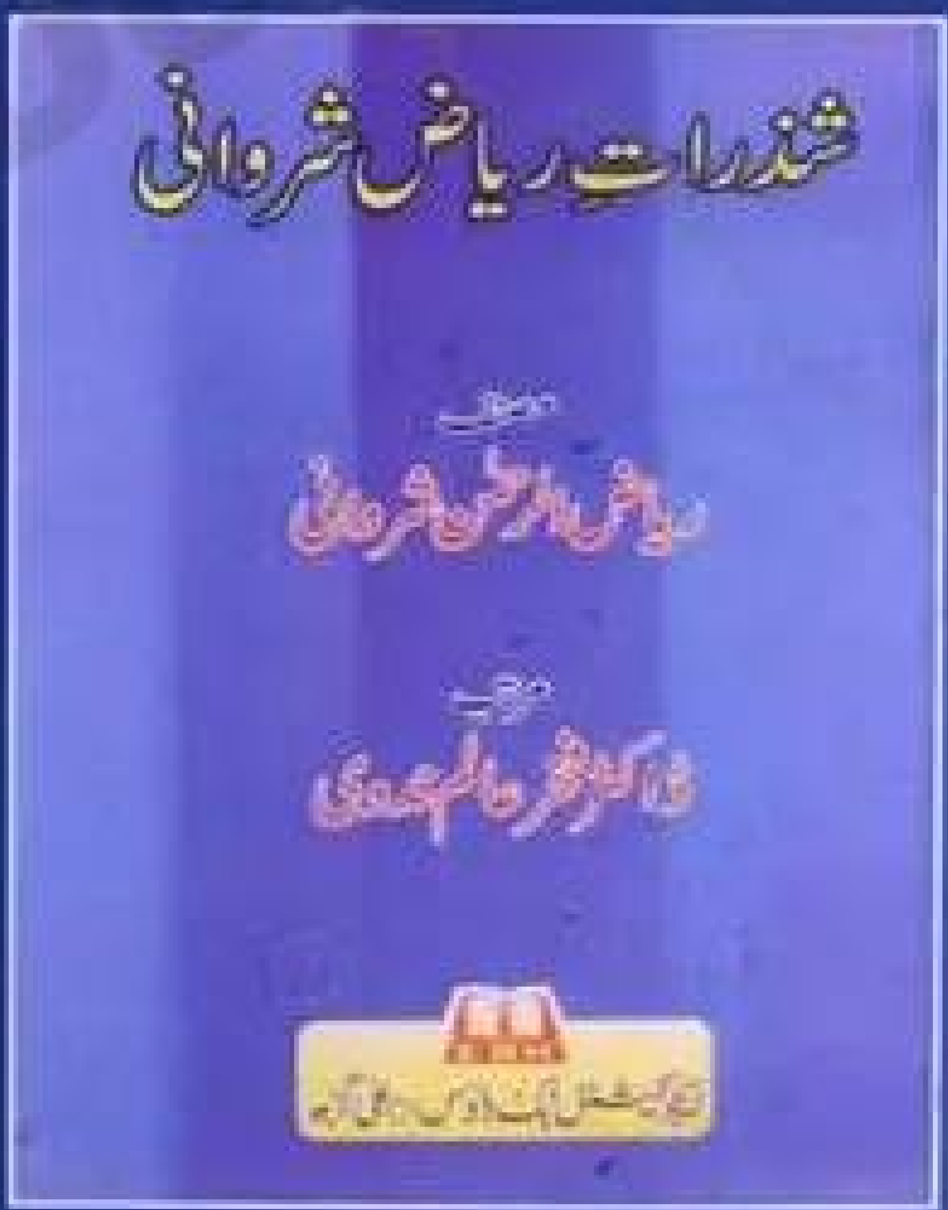
₹ 200/-



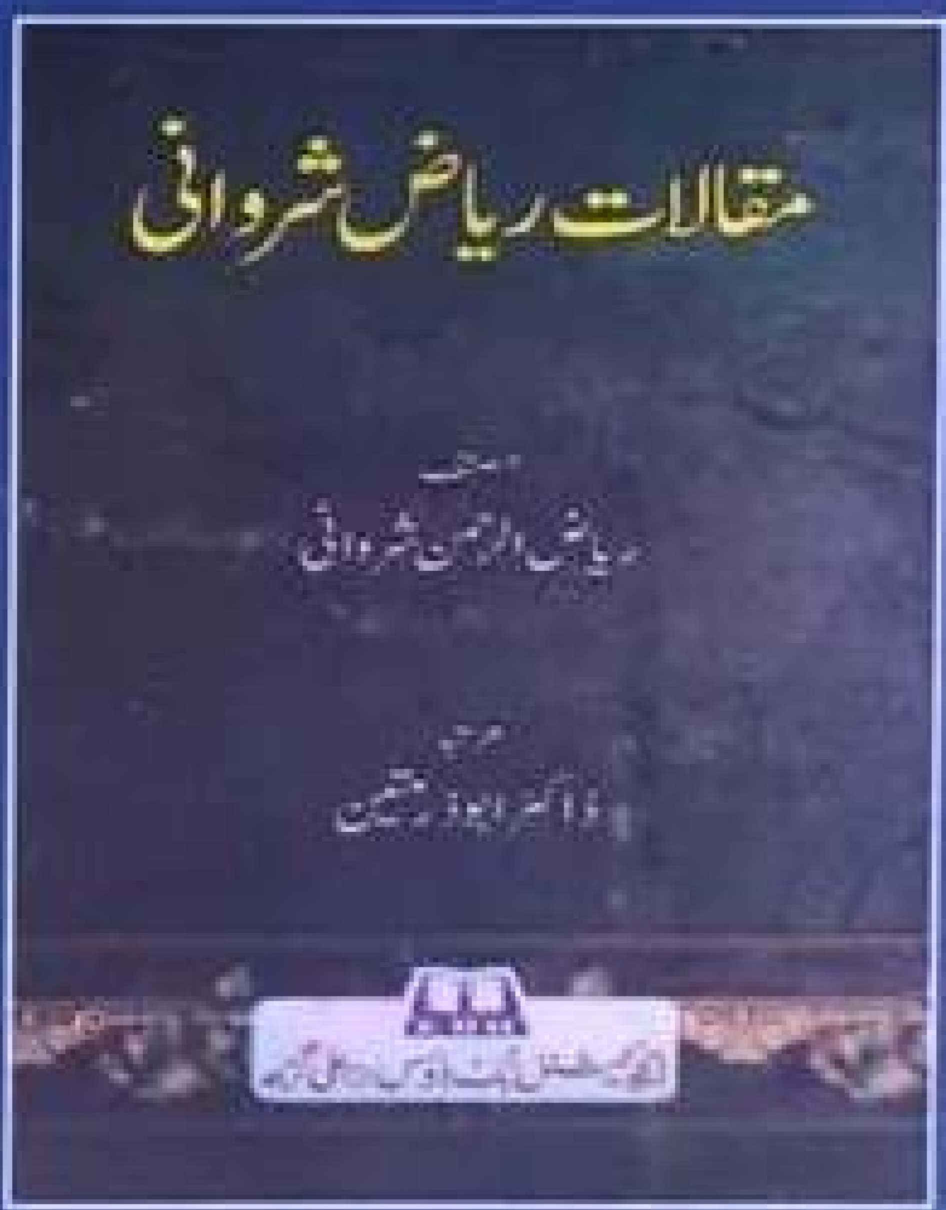
₹ 40/-



₹ 300/-



₹ 350/-



₹ 400/-

ملنے کا پتہ:

BROWN BOOKS

Opposite Blind School, Qila Road,
Shamshad Market, Aligarh-202001
Mob: +91-9818897975, Ph:0571 2700088
E-mail: bbpublication@gmail.com
Website: www.brownbooks.in